علم الانسان ما لم یعلم

۱۳۳۹

کتبخانہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی

شعبہ ۳۰ . ۲ س

شمارہ م ۸۵ و

عدد داخلہ ۲۳۳۹۶

A. H. Faruqi

تذکرہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ

حضرت مجدّدِ اعظم کی زندگی اور اُن کے فکر و نظر کی تشریح و توضیح

علّامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم

نفیس اکیڈیمی

بلاسس اسٹریٹ ــــــــــ کراچی (پاکستان)

قیمت مجلد چار روپیہ آٹھ آنہ

MAKTAB... MIA LTD
URDU BAZAR, ۲۳۳۹۶
DELHI-6

جملہ حقوق دائمی اِشاعت وطباعت بحق

چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری

مالک نفیس اکیڈیمی و مالک مسعود پبلشنگ ہاؤس

بلاسس اسٹریٹ کراچی۔ محفوظ ہیں

طبع سوم

جولائی ۱۹۵۹ء

مطبوعہ

انٹرنیشنل پریس کراچی

مولانا مناظر احسن گیلانی

حضرت مولانا گیلانی، بندہ پرور مولیٰ کے کرمِ خاص کی نشانی، پیدائش کے اعتبار سے قصباتی[1] مگر شہرت کے لحاظ سے عالمی، قد و قامت کے مختصر مگر فکر و نظر کے ناپیدا کنار سمندر، علم و بصیرت کے یگانہ مگر عام امورِ زندگی سے بیگانہ، دماغ کے زیرک مگر دل کے دیوانے، سوزِ خیالی و مستی کا سنگم! میدانِ تقریر کے شہسوار اور تحریر کے سید القلم۔

مولانا گیلانی کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی میں ہوئی، پھر تقریباً نو برس تک ٹونک میں امامِ معقولات مولانا حکیم برکات احمد صاحبؒ سے تلمذ کا شرف پایا، اس کے بعد منقولات کی تکمیل کے لئے دیوبند پہنچے اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ جیسے اساتذہ کے کامیاب ترین شاگرد رہ کر سندِ فراغ حاصل کی، اس کے فوراً بعد اسی درس گاہ کے استاذ بنا دیئے گئے اور رسالہ القاسم کی ادارت بھی مولانا ہی کے سپرد ہوئی۔

دو برس دیوبند میں رہے ہوں گے کہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) کی طلب و اصرار پر ۱۹۱۴ء شعبہ دینیات کے لکچرار کی حیثیت سے یہاں پہنچے اور ترقی کرتے کرتے صدر شعبہ کی حیثیت میں ۱۹۴۹ء میں ریٹائر ہوگئے۔ ریاست حیدر آباد کے سقوط اور حالات کی ابتری نے مولانا کو دل گرفتہ کر دیا تھا اس لئے لاچار ہو اپنے وطن گیلانی لوٹ گئے اور اسی عزلت میں ۵ جون ۱۹۵۶ء والی شب کو مولانا نے اس دار المحن سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پالیا، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً[2]

حضرت گیلانی کی موت ایک کرامت بن کر آئی، مولانا کے بھائی مکارم احسن صاحب کا بیان ہے کہ مرض الموت میں اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ "جنت میں کوئی بوڑھا نہ جائے گا، بلکہ ہر شخص جوان ہو کر جائے گا۔" چنانچہ جیسے جیسے مولانا کا وقتِ آخر قریب آتا گیا ان میں جوش و مسرت کی کیفیت بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ جس رات آخرت کو کوچ کرنے والے تھے اس رات تو فرطِ مسرت سے بے قابو ہو ہو جا رہے تھے اور اسی عالمِ فرح میں بظاہر سو بھی گئے مگر جب صبح اُن کو دیکھا گیا تو وہ رخصت ہو چکے تھے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ بوڑھے راہی کے چہرہ پر گوشت تر و تازہ اس کی سفید داڑھی بالکل سیاہ اور اس کا جسم نزار گداز تھا، کسی کی ایک آنکھ سے دیکھا ہوتا

[1] مولانا کا مولد قصبہ گیلانی (ضلع پٹنہ، بہار) ہے جس کی نسبت سے گیلانوی لکھنا زیادہ صحیح ہے مگر مولانا رحمہ اللہ خود کو محض گیلانی ہی لکھتے تھے۔ مولانا کا سنہ پیدائش ۱۸۹۲ء ہے۔

[2] صدق جدید مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۵۶ء

تو دھوکہ کا گمان بھی ہوتا مگر سارے قصبہ کے مسلمانوں نے اس "خلد آشیانی" کی یہ جوانی دیکھی اور اس وبا میں کیف روحانی پایا — سبحان اللہ وبحمدہ کیا حیات آفریں موت پائی! ع

مرگے کہ زاہداں بہ دعا آرزو کنند

مولانا گیلانی کے قلمی افادات کا آغاز ان کی طالب علمی ہی کے زمانہ سے ہوا اور اس کا انجام موت پر ہوا اس تقریباً ۴۰ سالہ عرصہ میں مولانا نے مختلف علوم وفنون پر متعدد کتابیں اور سیکڑوں مضامین لکھے اور ہر تحریر میں اپنے ذہن کی اُپج، فہم وفراست کی بلندی، مطالعہ کی وسعت، نظر کے عمق اور قوت اجتہاد کے زور کے پائیدار نقوش چھوڑے، مولانا کی سب سے پہلی کتاب "ابوذر غفاری" کو دیکھکر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمایا تھا کہ اس کتاب کا مصنف آگے چل کر محقق نکلے گا، چنانچہ یہی ہوا، اور بعد کو علمائے عصر نے اس کی تصدیق کی۔

مولانا کے جملہ مضامین اور تالیفات کا احاطہ تو یہاں مشکل ہے البتہ چند معرکۃ الآرا تصنیفات کے نام یہ ہیں۔

النبی الخاتم، الدین القیم، تدوین قرآن، تدوین حدیث، تدوین فقہ (غیر مطبوعہ) اسلامی معاشیات حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، تذکرہ شاہ ولی اللہ، نظام تعلیم وتربیت، مقالات احسانی، تفسیر سورۂ کہف (غیر مطبوعہ) وغیرہ!

حضرت گیلانی کی علمی منزلت اور ان کی تحریر کے زور اور اس کی حلاوت کا تو ایک عالم قائل ہے۔ مگر اس کے باطنی سبب یعنی مولانا کے عرفانی مرتبہ سے کم لوگ آشنا ہیں، حضرت گیلانی ایک سچے درویش تھے، قادریہ اور چشتیہ سلسلوں میں ان کو حضرت حبیب العیدروس بغدادی ثم حیدرآبادی اور حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدرآبادی سے خلافت حاصل تھی، وہ عشق نبوی اور حب الٰہی سے ہمیشہ سرشار رہتے تھے، ان کو حضرت شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہ کے مسلک ومشرب سے خاص مناسبت تھی اور اس کے وہ خاص ترجمان بھی تھے، اور جو مناسبت خاص حضرت گیلانی کو از راہِ تصوف شیخ اکبر قدس سرہ سے تھی۔ ویسی ہی مناسبت تامہ علمی وفکری راہ سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھی جس کے ثبوت میں یہ تذکرہ شاہ ولی اللہ سب کا فی ہے اور اہلِ نظر کے سامنے پیش ہے۔ "عیاں را چہ بیاں!"

خاک پائے بزرگاں

غلام محمد

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

[illegible]

یہ مسئلہ بڑی تفصیل و بسط کا طالب ہے کہ یورپ کی موجودہ بے دینی خود اس کے اس دین کی پیداوار ہے جس کی بنیاد عقیدہ "ولدیت" پر قائم تھی[1]۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کی تحریک گو ابتدا میں صرف کلیسا کے جبر و تسلط کے ردعمل کی شکل میں ظاہر ہوئی لیکن بتدریج بڑھتے ہوئے یہی تحریک مطلقاً مذہب اور دین کی بنیادوں پر ضرب بن گئی۔ کلیسا مذہب کی جس تشریح کو واجب التسلیم والتعمیل قرار دیتا تھا۔ شروع میں تو اس

---

[1] سورۂ کہف جس کے متعلق صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ دجالی فتنے سے جو محفوظ رہنا چاہتا ہے اس کو چاہیئے کہ اس سورہ کی ابتدائی یا آخری آیتوں کی تلاوت کرے۔ سورہ کی ابتدا میں عیسائیوں کے اس عقیدہ کا کہ خدا کیلئے یہ ولد (بیٹا) ثابت کرتے ہیں۔ اسکا تذکرہ کرنے کے بعد نسل انسانی کے سب سے بڑے بہی خواہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ "جن آثار یعنی نتائج کو چھوڑ کر عقیدہ ولدیت والے دنیا سے جائیں گے اور تمہاری بات یعنی قرآنی تعلیم، نہ مانیں گے، اس واقعہ پر کیا تم اپنے آپ کو ہلاک کر دو گے" حاصل یہ ہے ان قرآنی الفاظ کا یعنی "فلعلک باخع نفسک علی آثارھم ان لم یؤمنوا بھذا الحدیث اسفا" میرے نزدیک آثار جنہیں عقیدۂ ولدیت والے دنیا میں چھوڑنے والے تھے یہی وہ تماشے ہیں جنہیں یورپ اور یورپ کے زیر اثر ساری دنیا پیش کر رہی ہے۔ ہوا یہ کہ بجائے مخلوق کے حضرت مسیح علیہ السلام کو جب خدا کا بیٹا ٹھیرایا گیا تو قاعدہ ہے کہ انسان کا بیٹا انسان ہی ہوتا ہے، گھوڑے سے گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے، خدا کے بیٹے کو بھی ناگزیر تھا کہ خدا ہی مانا جائے اور اس میں وہ سارے صفات تسلیم کئے جائیں جو خدا کی خصوصیات ہیں۔ خدائی صفات کے ساتھ انسانی شکل میں مسیح کا وجود عیسائیوں کے لئے باعث فتنہ بن گیا۔ خدا سے بھی بنی آدم نے اس دلچسپی کا اظہار

اجتماعی تحریک کو اسی سے اختلاف تھا۔ اگرچہ یہ اختلاف بھی معمولی اختلاف نہ تھا۔ بڑی بڑی خوں ریزیاں اس آویزش کی بدولت صدیوں یورپ میں ہوئی ہیں جو عوام اور کلیسا کے درمیان قائم ہو گئی تھی؛ یہی زمانہ تھا جب یورپ کی قومیں کھولی گئیں۔ اور دنیا کے مختلف علاقوں میں بحری راستوں سے ان کا داخلہ شروع ہوا۔ شروع میں گمان کی حیثیت زیادہ تر سوداگروں اور بحری تاجروں کی تھی۔ لیکن دوسرے ارادے بھی ان کے سینوں میں پوشیدہ تھے؛ اسی لئے علاوہ تجارت کے مختلف قسم کے دوسرے کاروبار کا سلسلہ بھی ان ممالک میں جاری کر دیتے تھے جہاں گھس پڑنے کا ان کو موقعہ مل جاتا تھا۔ کاروبار کے اس دوسرے سلسلہ میں ایک اہم سلسلہ اپنے عقائد اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) نہیں کیا تھا یعنی دلچسپی عیسائیوں کو مسیح علیہ السلام کی ذات سے ہوئی پھر مسیح کے نام سے پوپ کا عہدہ جب قائم ہوا اور پوپ کی راہ سے کلیسا کا نظام عیسائیوں پر مسلط ہوا اس نے عیسائیوں کی جان، مال عزت و آبرو کے ساتھ وہ کھیل کھیلے جس کی دردناک داستان سے یورپ کی تاریخ بھری ہوئی ہے آخر صدیوں کی مصیبت برداشت کرنے کے بعد پروٹسٹنٹ تحریک کی شکل میں کلیسائی اقتدار کا ردعمل ہوا۔ ابتداء میں گو مذہب کی کلیسائی شکل کے خلاف یہ ردعمل تھا لیکن بات بڑھتی چلی گئی۔ اور آخر میں مطلقاً مذہب اور دین کے ردعمل کے قالب میں یہ تحریک ڈھل گئی مذہب کے انکار کا لازمی نتیجہ تھا کہ انسان انسان باقی نہ رہے اور ایک ترقی یافتہ حیوان سے زیادہ اس کی وقعت باقی نہ رہے۔ انسانیت کے متعلق حیوانات کے اسی خیال نے ان امور کی آبیاری کی۔ جن میں یورپ و امریکہ کے باشندے مبتلا ہیں۔ میرے خیال میں "علی آثارہم" میں آثار کے لفظ سے ان ہی چیزوں کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

ان باتوں کی پوری تفصیل میری کتاب سورہ کہف کی تفسیر میں مل سکتی ہے۔ ۱۲ منہ

خیالات کی اشاعت کا بھی ان کے سامنے تھا۔ اسی سے اندازہ کیجئے۔ کہ مغل دربار کے امیر دانشمند خان جن کی وفات آج سے تقریباً تین سو سال پہلے سنہ ۱۰۸۱ ہجری میں ہوئی یہ شاہجہان اور عالمگیر دونوں بادشاہوں کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز رہے۔ علاوہ سیاسی مہارت کے علم و فضل میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور دانشمند خاں میں بعض علمی مسائل پر شاہجہان کے سامنے بادشاہ کے اشارے سے مناظرے بھی ہوئے۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ ماثرالامراء میں ان کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

گویند کہ خان مذکور در انجام عمر بعلم اہل فرنگ مائل گردیدہ اکثرے از احکام تحریفات ان جماعت تکرار می نمود۔[۲۲]

کہتے ہیں کہ خان موصوف یعنی دانشمند خان آخر عمر میں اہل فرنگ کے علم کی طرف مائل ہو گئے تھے اور اہل فرنگ کے تحریفات (یعنی مذہب کے متعلق جو خیالات تھے) ان کو دھراتے رہتے تھے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہجہان بادشاہ کے زمانے ہی سے ہندوستان کے باشندوں پر مغربی خیالات و عقائد کا اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ یورپ میں اس وقت کلیسا کے خلاف جو کچھ ہو رہا تھا، ناممکن تھا کہ اس ملک سے آنے والے لوگ اس کا تذکرہ ان لوگوں سے نہ کرتے جن سے ان کا ملنا جلنا ہوتا تھا۔ خافی خان نے فرنگیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو حضرت مسیح اور مریم کی مورتیاں لکڑی وغیرہ سے بنا کر پوجتے ہیں۔ خافی خان کے الفاظ یہ ہیں

معبد خانہ آنہا برخلاف بت خانہ ہنود بحسب ظاہر بکمال صفائی کہ شعلہ ئے کافوری در آنجا می سوزند بنظر آید صورت حضرت مریم را علی نبینا علیہما الصلوٰت والسلام باعتقاد فاسد خود بر چندیں صورت از چوب و رنگ و روغن بزینت تمام ساختہ اند ص ۴۲۹/۲ج

ان عیسائیوں کی عبادت گاہ ہندوؤں کی عبادت گاہوں کے برخلاف بڑی صاف ستھری رکھی جاتی ہے۔ اور کافوری شمع دن کو بھی جلتے ہوئے میں نے دیکھا۔ حضرت عیسیٰ اور مریم کی صورت لکڑی سے بنا کر اور رنگ و روغن کر کے سجا کر انتہائی زینت کے ساتھ رکھتے ہیں۔

خافی خان نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

اما در کلیسائے انگریز کہ آنہا نیز نصرانی اند صورت بطریق اصنام نمی باشد ص ۴۲۹

لیکن انگریز کے گرجوں میں مورتیاں اور تصویریں بطور بتوں کے نہیں ہوتیں حالانکہ یہ بھی نصرانی ہی ہیں ؎

آگے اس کی بھی خافی خان نے تصریح کی ہے

محرر اوراق گرد داں مکان و بنا در رو او گشتہ و با علمہائے آنہا صحبت

محرر اوراق (یعنی خود مصنف) بسا اوقات ان کی عبادت گاہوں اور ان بند گاہوں

؎ اس موقع پر میکنزی نے اپنی مشہور کتاب "اخلاقیات" (تھکس) میں جو یہ لکھا ہے سننے کے قابل ہے لکھتا ہے "کہ خدائے مسیح اور مریم کی تصویریں کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی بنا کر ہمارے سامنے کیوں نہ پیش کی جائیں مگر ہمارا سر عبودیت ان کے سامنے نہیں جھک سکتا" ص ۱۹۔ یہ مشہور فلسفی ہیگل کا قول ہے لیکن یہ کیفیت یورپ کے بت پرستوں میں کس کی آواز نے پیدا کی؟

واشتہ مذاکرہا نمود. صفحہ ۲۶۹ ج ۲	میں جہاں ان کے گرجے میں پہنچا ہے اور ان لوگوں کے علما سے ملنے جلنے کا موقع بھی اسکو ملتا رہا۔ ان کے علماء سے بحث ومباحثہ بھی کرتا رہا ہے۔

یہ چند سرسری شہادتیں ہیں جن سے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ سیاسی اقتدار و تسلط سے پہلے اور بہت پہلے جس وقت اس کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ سوداگروں کا یہ گروہ مشرقی ممالک پر بادشاہی کرنے کے لئے بلایا گیا ہے۔ یعنی مغل حکومت جب اپنی قوت و اقتدار کے عہد شباب میں تھی۔ اسی زمانے میں یورپ کے عقائد وخیالات کا اثر مشرق کے باشندوں پر پڑنے لگا تھا خصوصاً جہاں بندرگاہیں تھیں یا تجارتی کوٹھیاں یورپ والوں کی قائم تھیں۔ وہاں جن لوگوں کی آمد ورفت تھی، ان کے نہ متاثر ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ اور یہی لوگ جب اپنے اپنے اوطان واپس ہوتے تھے دوسروں تک بھی ان خیالات کو وہ پہنچاتے تھے۔

ماننے والے اس کو مانیں یا نہ مانیں لیکن اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایران کے شیعوں میں خصوصاً اور عام شیعوں میں عموماً "اخباریہ" کے نام سے جس تحریک کا غاز دسویں صدی ہجری کے اختتام اور گیارہویں کے شروع میں ملا محمد امین کے ہاتھوں ہوئی! ورصاحب نجوم السماء نے جن کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں کہ:۔

اوست اول کسے کہ دروازہ طعن بر مجتہدین کشادہ فرقہ ناجیہ امامیہ آتنا	ملا محمد امین پہلے آدمی ہیں جنہوں نے مجتہدین پر طعن کا دروازہ کھولا اور فرقہ

عشریہ را بدو قسم منقسم ساخت۔ یکے اخباری و دیگر مجتہدی ص ۱۴۱	ناجیہ امامیہ اثنا عشریہ یعنی شیعوں کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ ایک اخباری (جو ملا امین کے پیرو تھے) اور دوسرے مجتہدی (یعنی مجتہدین کو ماننے والے)

ہم اس تحریک کے متعلق نہیں کہہ سکتے کہ کلیسا اور پروٹسٹنٹ فرقے کی باہمی آویزش سے جو مسائل یورپ میں پیدا ہوئے تھے اور مغربی سوداگروں کی راہ سے مشرقی ممالک میں ان کے چرچے پہنچ رہے تھے۔ ان سے ایران کی یہ اخباری تحریک کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اور سا ایران تو ایران خود ہندوستان کا مشہور تجارتی شہر برہان پور جو مغلوں کے عہد میں ہندوستان کا گویا لنکا شائر یا مانچسٹر ہونے کی حیثیت صنعت پارچہ بافی میں رکھتا تھا۔ اور بکثرت اسی تعلق سے یورپ کے تاجروں کی آمد و رفت کا یہ آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد جہانگیری کے ایک عالم قاضی نصیر الدین خلف سراج الدین جن کی وفات ۱۰۲۹ھ ہجری میں ہوئی ہے ان کے متعلق بھی تاریخ نے یہ یادداشت چھوڑی ہے کہ :-

قاضی ہر قسم حدیث را ترجیح می داد۔ و انکار قیاس مے نمود[1] ص ۱۵۳ (تاریخ برہانپور)	قاضی نصیر الدین ہر قسم کی حدیثوں کو ترجیح دیتے تھے۔ اور قیاس کا انکار کرتے تھے

---

[1] قاضی نصیر الدین میں اور ان کے حریف شیخ علم اللہ میں اسی تقلید و عدم تقلید کے مسئلہ میں بڑے جھگڑے ہوئے لکھا ہے کہ خان خاناں قاضی نصیر الدین کا حامی تھا اس لئے کوئی گزند ان کو نہیں پہنچا۔ بعد کو جب خان خاناں کی کمان اتر گئی اور جہانگیر نے حکم دیا کہ قاضی نصیر اور شیخ علم اللہ دونوں کو دہلی روانہ کر دیا جائے تب دونوں صاحب

ظاہر ہے کہ مجتہدین پر زبان لعن و طعن دراز کرنا اور اخبار یعنی براہ راست حدیثوں سے نتائج نکال کر ان ہی پر عمل کے لئے لوگوں کو آمادہ کرنا جو شیخ امین ایرانی کی تحریک تھی، یا قاضی نصیر کا قیاس سے منکر ہو جانا اور حدیثوں سے مسائل کے پیدا کرنے کا دعویٰ کرنا اس میں اور رومن کیتھولک (یعنی کلیسا کے ماننے والے عیسائیوں) میں اور پروٹسٹنٹ فرقہ میں جو جھگڑا تھا" دونوں میں اس کے سوا اور کیا فرق ہے؟ کہ یورپ میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا اور ایران و ہندوستان میں اس جھگڑے کا تعلق اسلام سے تھا۔ پروٹسٹنٹ عقیدے کے ماننے والے بھی تو کہتے تھے کہ ہم کلیسائی کے ان اجتہادی نتائج کے ماننے پر مجبور نہیں ہیں۔ جو تورات و انجیل سے علماء کلیسا

(بقیہ صفحہ ۱۸) کا ہرہان پور سے بھاگ گئے قاضی نصیر مکہ معظمہ چلے گئے، پانچ سال کے بعد واپس ہندوستان لوٹ رہے تھے۔ کہ ان کے جہاز کو فرنگ کے جہاز والوں نے پکڑ لیا۔ عجیب بات یہ نقل کی ہے کہ قاضی نصیر کے علم و فضل سے واقف ہونے کے بعد فرنگی قاضی صاحب کو "نزد پادشاہ خود بردند" واللہ اعلم اس "پادشاہ" کے لفظ سے کیا مراد ہے۔ کیا ان کو یورپ لے گئے بظاہر یہ فرنگی پرتگالی معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے بحیرۂ ہند و بحیرۂ عرب کو اس زمانے میں اپنی تاخت و تاراج کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ آگے اسی کتاب میں ہے کہ قاضی نصیر جب فرنگیوں کے بادشاہ کے پاس پہنچے تو آداب شاہی بجا نہ لائے پوچھا گیا تو جواب دیا کہ ہم سے یہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔ فرنگی بادشاہ نے ان کو چھوڑ دیا۔ رہا ہو کر یہ بیجاپور آئے ابراہیم عادل کا زمانہ تھا کئی میل آگے بڑھ کر اس نے استقبال کیا۔ پھر یہ شاہجہان کے پاس پیش ہوئے جو برہان پور میں صوبیدار ہونے کی حیثیت سے آیا تھا۔ شاہجہان نے جہانگیر کے پاس بھیج دیا۔ جہانگیر نے بھی ان کا احترام کے ساتھ رکھا اور چند دن بعد وطن برہانپور واپس کر دیا۔ وہیں ۱۰۱۴ھ میں وفات پائی۔

(ص ۱۵۴ تاریخ برہانپور)

نے پیدا کئے ہیں بلکہ براہ راست ہر عیسائی کو حق حاصل ہے کہ وہ خود تورات اور انجیل کو سمجھے اور خود آزادانہ نتائج پیدا کرے۔ الغرض قصہ ایک ہی تھا قصہ کا تعلق مغرب میں عیسائی مذہب سے تھا۔ اور مشرق میں اسلام سے تھا۔ اسی بنیاد پر میں تو نہیں سمجھتا کہ عرب کی اس تحریک کے متعلق جو نجدی عالم شیخ محمد بن عبدالوہاب کی طرف منسوب ہو کر وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی ہے۔ اس کے متعلق طامس پیٹرک نے جو یہ لکھا ہے :۔

"وہابیت کو بسا اوقات اسلام کا پروٹسٹنٹ فرقہ بنایا جاتا ہے۔ اگرچہ فرق یہ ہے کہ عیسائی پروٹسٹنٹ مقدس الہامی کتابوں کی اعلیٰ حیثیت تسلیم کرتے ہوئے روائتی تعلیمات کو مسترد کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہابیت قرآن کے ساتھ ساتھ حدیثوں پر بھی زور دیتی ہے۔"

اس کے انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ "اگرچہ" کے بعد مصنف مذکور نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس میں وہ "روائتوں" اور "حدیثوں" کے فرق کو سمجھ نہیں سکا ہے۔ حدیث کی حیثیت ہمارے ہاں علماء کی روائتوں کی نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو براہ راست پیغمبر اسلام کے ملفوظات، اعمال و افعال وغیرہ کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس کے لفظ سے حدیث کا غلط ترجمہ یورپ میں جو پھیل گیا ہے یہ مغالطہ اسی غلط ترجمہ کا نتیجہ ہے۔

بہرکیف شیخ ابن عبدالوہاب نجدی کے متعلق جب ہمیں معلوم ہے۔ کہ زمانہ تک ان کا قیام مشرق و مغرب کی کڑی ملانے والی مشہور تاریخی بندرگاہ

بصرہ[1] میں رہا ہے۔ اور بقول ان کے ایک عقیدت مند کے:۔

"بصرہ میں یہ جذبہ (یعنی جذبہ وہابیت) اور تیز ہو گیا" ص۲۵

اور اسی تیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بصرے میں

"ان کو طرح طرح کی تکلیفیں جھیلنی پڑیں اور آخر بصرہ انہیں چھوڑنا پڑا"۔ ص۲۵

کتاب محمد بن عبدالوہاب

بہرحال کچھ بھی ہو واقعات اس کے شاہد ہیں۔ کہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے سے پہلے اور بہت پہلے مشرق پر بتدریج مغرب اپنا ذہنی تسلط قائم کرتا چلا جا رہا تھا اور مسلمانوں میں مختلف قسم کی مذہبی بے چینیاں پچھلی چند صدیوں میں جو رونما ہوئیں ان میں بہت کچھ دخل اسی ذہنی تسلط کی تدریجی ترقی کو ہے جیسے جیسے سیاسی اقتدار کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ اسی نسبت سے ذہنی تسلط کے پنجوں کی گرفت بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جاتی تھی۔ گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ یورپ کی تلوار، یورپ کے قلم اور زبان کے پیچھے پیچھے مشرقی ممالک میں آئی ہے اور کسی نہ کسی حیثیت سے سارے اسلامی ممالک یورپ کے ان ذہنی تغیرات و انقلابات سے متاثر ہوتے چلے جاتے تھے اس وقت خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ کہ اگر ان مغربی خیالات کی اثر اندازیوں کی رفتار کا یہی حال رہا تو ایک طرف سلبی نتیجہ تو اس کا یہ ہوگا کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال سے بھی زیادہ زمانہ میں دنیا کے مختلف

---

[1] بصرہ آج ہی نہیں زمانہ سے اپنے محل وقوع کی خصوصیات کی وجہ سے مختلف مذہبی فرقوں کے خروج کا مرکز بنا رہا ہے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عموماً اسلامی فرقے بصرہ ہی میں پیدا ہوئے جس کے اسباب طویل ہیں۔ کسی دوسری کتاب میں ان اسباب کی تفصیل کی جائے گی۔ ۱۲

حصوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں نے اسلام کو سمجھ کر مختلف پہلوؤں سے اسکی تشریح و تعبیر کی ہے جن سے کتب خانوں کے کتب خانے بھرے ہوئے ہیں آن واحد میں سب ملیامیٹ ہو کر رہ جائیں گے۔ ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل اور ان بزرگوں کے ماننے والے علمائے فقہ کی تدوین و تربیت میں جو جانکاہیاں کی ہیں سب کالعدم یکسر ہو کر رہ جائے گی اور فقہ ہی کیا مسلمانوں کا تصوف، مسلمانوں کا کلام اور ان کے سوا ان ہی علوم کے معاون فنون جنہیں خون جگر پلا پلا کر مسلمانوں کے اہل علم نے پالا تھا ان کی کوئی وقعت باقی نہ رہے گی اور اس سلبی خطرے کے ساتھ دوسرا اثباتی خطرہ اس لازمی فتنے کا تھا جس کا پھوٹ پڑنا ایسی حالت میں ناگزیر ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اسلامی دین میں دنیا کی قومیں جب ابتدا میں داخل ہوئی تھیں تو ہر قوم اپنے ساتھ موروثی جراثیم کو لے کر داخل ہوئی۔ اسلام کی ابتدائی چند صدیاں اس لحاظ سے بڑی نازک تھیں، بکر نومسلموں کا یہ گروہ چاہتا تھا کہ اسلامی مسلمات اور اپنے موروثی خیالات میں مصالحت و مطابقت پیدا کر کے کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ آبائی مالوفات سے بھی بالکلیہ تعلق منقطع نہ ہو۔ اور ہم مسلمان بھی باقی رہیں۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں فرقہ بندیوں کی جو بھرمار نظر آتی ہے۔ منجملہ دوسرے اسباب و وجوہ کے ایک بڑا سبب اُن کا یہ بھی تھا۔ لیکن بتدریج آبائی خیالات و نظریات سے اُن کی پچھلی نسلوں کے تعلقات مضمحل ہوتے چلے گئے اور "اہل السنت والجماعت" کی شکل میں مسلمانوں کی اکثریت خالص اسلامی مطالبات کے باعث کامیاب ہو گئی۔ اس کے بعد فرقہ بندیوں کے سارے قصے محض کتابوں کی تاریخ داستان بن کر رہ گئے۔ نہ فرقے باقی رہے نہ ان کی کتابیں باقی رہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کہ

ابتدائی صدیوں کے فرقوں میں سب سے بڑا منہ زور صاحب قلم بلکہ بعض اوقات صاحب سیف بھی معتزلہ کا فرقہ تھا۔ لیکن معتزلہ کا یہ حال ہے کہ ان کے عقائد و خیالات کی کتاب کیا کتاب کے کسی ورق کا ملنا بھی دشوار ہے۔ جو کچھ علم اس فرقے کے متعلق دنیا رکھتی ہے۔ زیادہ تر وہ اہل سنت کی کتابوں ہی سے ماخوذ ہے ___ تردید و اصلاح کے لئے لوگوں نے اُن کے خیالات نقل کئے ہیں۔ یا عقائد و اعمال کے علاوہ کسی دوسرے فن مثلاً تفسیر یا لغت وغیرہ میں ایک دو بچی کھچی کتابیں معتزلہ کی رہ گئی ہیں جن میں چھپا چھپا کر کہیں کہیں اپنے عقائد بھی (ان) کے مصنفوں نے شریک کر دئے ہیں۔

خیر یہ داستان تو طویل ہے کہنا یہ ہے کہ کھل کھلا کر سارے اسلامی فرقے چونکہ پانچویں صدی سے وحدت کے نقطہ پر مجتمع ہو گئے وہی اہل السنت والجماعت کے نام سے آج دنیا میں مشہور ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کے مسلمان جن کی تعداد چالیس پچاس کروڑ سے ستر کروڑ تک بتائی جاتی ہے۔ اور ایشیاء افریقہ بلکہ یورپ کے بعض علاقوں میں متفرق طور پر وہ آباد ہیں لیکن اتنی بڑی تعداد جو اتنے دور دراز ممالک میں پھیلی ہوئی ہے بجز ایک اقلیت قلیلہ (گویا ہزار میں شاید ایک ہونے کی نسبت رکھتے ہوں) یعنی شیعہ فرقہ کے دنیا کے یہ سارے مسلمان وہی ایک عقیدہ ایک مسلک رکھتے ہیں جس کی تعبیر اہل السنت والجماعت کے عقائد و مسلک سے کی جاتی ہے۔ البتہ فروعی مسائل کے بعض پہلوؤں میں ہلکی قسم کا ایک اختلاف سنیوں میں بھی پایا جاتا ہے یعنی وہی اختلاف جس کی وجہ سے بعض حنفی بعض شافعی، مالکی یا حنبلی کہلاتے ہیں۔ مختلف ممالک و اقالیم کے کروڑہا کروڑ انسانوں

میں چار ہی قسم کے یہ اختلافات بجائے خود کچھ کم محل تعجب نہیں ہیں اور یہی بات یہ ہے کہ اہل السنت والجماعت کے اس اختلاف کو واقعی اختلاف وہی قرار دے سکتا ہے جس کی نظر حقائق و واقعات پر نہ ہو۔ آخر جب ان میں ہر ایک دوسرے اماموں کا اسی قدر احترام کرتا ہے جتنا احترام اپنے امام کا دل میں رکھتا ہے۔ سب ہی کو "رحمۃ اللہ علیہ" کی دعا کے ساتھ بلا استثناء ہر ایک یاد کرتا ہے۔ آخرت میں قربت ثواب کے لحاظ سے قطعاً کسی امام کو دوسرے امام پر ترجیح نہیں دی جاتی۔ اور ائمہ ہی نہیں ان مختلف ائمہ کے ماننے والے علماء و صوفیا کے ساتھ تقریباً ہر سنی مسلمان وہی تعلق رکھتا ہے جو تعلق اس کا اپنے امام کے ماننے والے علماء و صوفیا سے ہوتا ہے۔ غزالی، رازی، شافعی مذہب کے علماء ہیں لیکن کیا کسی حنفی کے دل میں ان لوگوں کی عزت شافعیوں سے کم ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ حالانکہ حنبلی مسلک رکھتے تھے۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حنفیوں میں عظمت و احترام کا جو مقام ان کو حاصل ہے حنابلہ میں بھی ان کو تلاش کرنا مشکل ہے؟ میں نے اپنی کتاب تدوین فقہ کے ابتدائی حصہ میں اس موضوع پر تفصیل بحث کی ہے۔ اسوقت ان چند اشاروں پر اکتفا کر کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کرۂ زمین کی اتنی عظیم اکثریت میں وحدت خیال و مسلک کا یہ معجزانہ رنگ اسلام نے جو پیدا کر دیا تھا۔ اس کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ شیرازہ ٹوٹ جائے گا۔ اور وہی امت جو اس وقت بشکل چار اماموں کے اجتہاد و استنباط پر مجتمع ہو گئی ہے۔ اسی میں ہر فرد امامت کا مقام حاصل کر کے اس ایک دین کو چالیس پچاس دین یا فرقوں میں تقسیم کر دے گا۔ آخر جب ائمہ اجتہاد سے بغاوت کا صور پھونکا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ کہ

ہر شخص کو محض اس لئے کہ وہ مسلمان ہے قرآن و حدیث کے مطالب کے تعین اور نتائج کے استنباط کا اختیار دے دیا جائے اور جیسا کہ انسانی فطرت کا تجربہ ہے یعنی ہر شخص کی شکل و صورت الگ الگ ہے اسی طرح آراء و خیالات میں بھی شتر بے مہاری کے اس دور میں لوگوں کا الگ الگ ہو جانا اس کا ایک قدرتی نتیجہ ہوتا مسلمانوں کو منتشر اور پراگندہ ہونے کے بعد ایک نقطہ پر جمع کرنے میں سالہا سال کی کوششوں کے بعد جو کامیابی ہوئی تھی یہ کامیابی صفر بن کر رہ جاتی۔

میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جب ہندوستان میں ہوش سنبھالا تو ان تک یورپ کے اس مخفی ذہنی تسلط اور آئندہ اس سے پیدا ہونے والے خطرات کا علم کس راہ سے پہنچا۔ لیکن اپنی پوری زندگی جس جد و جہد میں حضرت شاہ صاحب نے صرف کی، اس کے ایک بڑے حصے کا تعلق یہ عجیب بات ہے کہ ان ہی پیدا ہونے والے خطرات کے انسداد سے معلوم ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ ایک مسلک وسط کے پالینے میں کامیاب ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی فقہ بھی بچ گئی، تصوّف بھی تباہی سے محفوظ رہا۔ قدیم علم کلام کی بنیاد پر ایک ایسے جدید علم کلام کی بنیاد ان کے ہاتھوں سے قائم ہو گئی جس میں کلام کے ساتھ تصوف اور تصوف کے ساتھ علم کلام کی ایسی معتدل آمیزش ہوئی ہے کہ اس کی بدولت مسلمانوں کا تصوف بھی زندہ ہے اور ان کے کلامی نظریات کی بھی زیادہ واضح شکلوں میں زندہ رہنے کی ضمانت پیدا ہو گئی۔ اور اسی کے ساتھ پچھلے زمانے میں دین کے اصلی سرچشموں سے علمائے اسلام کو تھوڑا بہت جو بُعد پیدا ہو گیا تھا

اور یہ فطری بات ہے کہ نتائج وثمرات کی مشغولیت عموماً اصول سے دُوری کا سبب بن جاتی ہے۔ لیکن شاہ ولی اللہ نے ایک ایسا محتاط متوازن قدم اٹھایا کہ نتائج وثمرات کی مشغولیت میں کسی قسم کی افسردگی بھی پیدا نہیں ہوئی ہے اور اسلام کے اساسی سرچشموں یعنی قرآن وحدیث کے ساتھ اہل علم کے تعلقات نئے سرے سے تر و تازہ ہو گئے۔ تقلید جامد کا وہ طلسم بھی ٹوٹ گیا جو تقلید کی کہنگی سے عموماً قائم ہو جاتا ہے اور آزادی رائے کے ساتھ تحقیقی تقلید کا ایک ایسا رنگ ان کے اور ان کے تلامذہ کے درس و تالیف نے پیدا کیا کہ ہر چیز اپنے اپنے طبعی مقام پر آکر ٹھہر گئی۔

یورپ کے سیاسی اقتدار سے پہلے ہی ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کا یہ کام مکمل ہو چکا تھا اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اپنے سیاسی اقتدار کے ساتھ یورپ مسلمانانِ ہند پر مسلط ہو گیا تو گو شروع میں کچھ ہلچل ضرور پیدا ہوئی۔ ایک طبقہ اس ملک میں پیدا ہو گیا تھا جو متوقعہ خطرات کے راستوں کو صاف کرنے لگا۔ لیکن شاہ ولی اللہ کا مکمل نظام پہلے سے اس ملک میں موجود تھا۔ مقابلہ کرنے والے اس نظام کو لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور تیس چالیس سال کی کش مکش کے بعد جو ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ وہ دب گئی۔ البتہ اس کے بعد تعلیم کے اس جدید نظام کے تحت جسے حکومت مسلطہ نے اس ملک میں نافذ کر رکھا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ان کو سب کچھ پڑھا دیا گیا ہے حالانکہ قطعی طور پر ان بیچاروں کو بالکل یک طرفہ تعلیم دی جا رہی ہے وہ جس حد تک یورپ کے جدید علوم و فنون اور ان کے مسائل کے عالم بنائے جاتے ہیں۔ اس حد تک

ان کو اسلام اور اسلامی حقائق و مسلمات سے جاہل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جدید تعلیم سے استفادہ کرکے ملک میں تعلیم یافتوں کا یہ گروہ جو پھیلا دیا گیا ہے۔ اس کا حال نہ ان عوام کا ہے جو اپنے جہل کے صحیح علم کے بعد مذہب کے علماء کے سامنے گردن جھکا دینے میں شرم محسوس نہیں کرتے تھے وہ جانتے تھے کہ نہ جاننے والوں کا فرض ہے کہ جاننے والوں کی باتوں کے آگے سر تسلیم خم کردیں اور نہ ان بیچاروں کو مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ خود فیصلہ کرسکیں کہ ان کے مذہب کی واقعی صحیح تعلیم کیا ہے؟ وہ مذہب کے علماء سے بدگمان ہیں ان میں یہ خیال پیدا کردیا گیا ہے کہ ملا جو ان کے مذہب کے علماء کی خراسانی اور تاتاری تعبیر ہے یہ جو کچھ بتاتا ہے یہ اسلام نہیں ہے مگر اپنے جہل و ناواقفیت کی وجہ سے وہ اس کا بھی صحیح فیصلہ نہیں کرسکتے کہ آخر اسلام کیا بتاتا ہے۔

اس میں کچھ دخل اس بات کو بھی ہے کہ مذہب کی تعلیم اس زمانے میں جس طریقے سے علماء پا رہے ہیں۔ وہ تعلیم کا قدیم طریقہ ہے۔ ہر زمانہ کے علم کی ایک زبان ہوتی ہے۔ اس زبان اور اس تعبیر سے ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اپنے خیالات کو وہ زمانہ کی عصری زبان اور تعبیر میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں نقائص تعلیم کے دونوں نظاموں کے نقص سے پیدا ہوئے ہیں لیکن یہ نقص کوئی بڑا نقص نہیں ہے ایسی کوتاہی نہیں ہے جس کا ازالہ نہ ہو سکے تعلیم کے نظام کی دوئی کو ختم کرکے آج مذہبی تعلیم کا دامن عصری علوم و فنون کے ساتھ اگر جوڑ دیا جائے جیسے اپنی گزشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمان برابر یہی کرتے چلے آئے۔ تو ساری غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور شاہ ولی اللہ کا کام کم از کم ان خطرات کے سدّباب

کے لئے کافی ہے جو "عقیدۂ ولایت" کے آثار سے یورپ میں پیدا ہوئے ہیں ۔

آئندہ اوراق میں آپ کو حضرت شاہ ولی اللہ کی زندگی کا ایک سرسری تذکرہ اور ان کے کارناموں کا اجمالی ذکر ملے گا۔ ایک شہری مجلہ کے لئے مختصر سا مقالہ لکھا گیا تھا باوجود انتہائی اختصار کے لوگوں کا خیال ہے کہ کافی پھیل گیا ہے۔ اسی لئے مستقل کتاب کی شکل میں اسی کو وہ شائع کر رہے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک اس کتاب کی حیثیت شاہ صاحب کی حقیقی سوانح عمری کے مقابلہ میں گویا وہی ہے جو دریا کے مقابلہ میں قطرے کی ہوتی ہے مگر چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری صاحب کو شاہ صاحب کی ذات سے ایسی عقیدت ہے کہ وہ اس "عجالہ مختصرہ" کو بھی بہت کچھ سمجھتے ہیں اشاعت کی اجازت انہوں نے مجھ سے چاہی، کارِ خیر سے مانع بننے کی کوئی وجہ مجھے نظر نہ آئی۔ ہذا والسّلام

مناظر احسن گیلانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی والصَّلوٰۃ وَالسَّلامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِی شَان

(العزیز الرحیم)

ہر لحظہ جمال خود لنوع دگر آرائی

شور دگر انگیزی شوق دگرافزائی　　(العارف والجامیؒ)

ہر چڑھاؤ کے بعد اتار

یہی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اور کیوں نہ جب کہ اس پیکر رحمت کی زبان مبارک سے بھی جو جمال آرائیوں کے ارتقاء کی رفتار کا منتہائے کمال تھا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

انی لاری الفتن تقع فی بیوتکم　　میں فتنوں کو دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں میں

کوقع المطر　　(صحیح بخاری)　　اسطرح برس رہے ہیں جیسے بارش برستی ہے۔

کیا "خیر القرون" کے کان میں آواز آئی تھی اور جو سنایا گیا تھا۔ کیا ایمان والوں کو نہ ہی دکھایا نہیں گیا؟ ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے آنگن سے تو اس فتنہ کا صرف بادل اٹھا تھا لیکن ابوبکرؓ ہوں یا عمرؓ، علیؓ ہوں یا طلحہؓ، زبیرؓ ہوں یا انسانیت کے اس بہترین عہد کی کوئی اور ہستی (رضوان اللہ علیہم) کن کے گھروں میں ان فتنوں کو مسلسل برستے ہوئے نہیں پایا گیا! پھر جب اس دنیا کی ریت یہی ہے کہ

نہ گل از داغ غمت رست نہ بلبل در باغ

ہمہ را نعرہ زناں جامہ دراں مے داری　　(الحافظ الشیرازی)

اور جب اس ابتلائی زندگی کے خیر سے شر کے عنصر کا جدا کرنا ناممکن ہے۔ تو بجائے

اپنی مرضی کے مطابق دہر کو کیوں کر کروں
مجھ کو بھی غصہ آتا ہے مگر کس پر کروں (السان العصر مرحوم)

کی ہے معنی تلملاہٹ رنج اور کڑھن کے ـــــ "اطمینان" کے خیال سے ہٹ کر اطمینان کے میدان میں لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (تا کہ ہم تمہیں جانچیں کر اپنے اپنے کرداروں کی رو سے کون تم میں سے اچھا ہے اور بھلا ہے) پڑھتے ہوئے ہم کیوں نہ اتر جائیں۔

اور یہاں کی ہر لحظہ کی "شورانگیزیوں" کو بجائے گھبرانے اور بھاگنے کے اپنی "شوق افزائیوں" کا ذریعہ کیوں نہ بنالیں ہر "شور" پر نیا "شوق" پیدا ہونا بھی تو انسانی زندگی کی جان ہے۔ اگر "شر" کے وجود ہی کو ختم کر دیا جائے گا۔ تو "خیر" خواہوں اور "خیر طلبوں کے لئے اجر و مزدوری کا "استحقاق" ہی کب باقی رہے گا۔ "الشیطان" کے وجود کو نگلنے والوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اس ملعون کے ہٹ جانے کے بعد انسان کی فطرت اب مقابلہ کس کا کرے گی؟ تم سے ٹکرا کر بلاشبہ وہ جہنم میں گرتا ہے لیکن تم کو تو اس کی ٹکر جنت میں پہنچاتی ہے۔ بلفظ دیگر ارتقاء اس دنیا میں دونوں کا یہی قانون ہے اور صرف یہی قانون ہے۔

چڑھاؤ کے بعد اتار اور عروج کے بعد زوال کا راز یہی ہے۔ تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (ان چند دنوں میں دنیاوی دولت و قوت کو ہم لوگوں میں چکر دیتے رہتے ہیں) کے ارشاد قرآنی کی یہی تفسیر ہے اور یہی بات بھی یہی ہے۔ نجد کی وادی کا قیس ہی کیوں تنہا ٹھیکہ دار بنا ہے۔ اس وادی میں اترنے والے اترتے رہیں گے اور "بہرکسے پنجہ زد و نوبت اوست" کی نفیری پھونکتے

ہوئے فی جنّۃٍ عالیۃٍ کی بلند ٹیکری کی طرف چڑھتے ہوئے رضوانٌ من اللہ اکبرُ کے "مقام امین" اور "مقعد صدق" تک پہنچتے چلے جائیں گے۔

الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کی انتہا

چند دن ہوئے کہ ہندوستان کے ایک تجدیدی کارنامے کی داستان سنانے کی سعادت میسر آئی تھی بتایا گیا تھا۔ کہ اخلاص و وفا اور صدق و صفا کے سوا جس "فقیر بے نوا" کے پاس قوت و طاقت کا کوئی سرمایہ نہ تھا۔ وہ اپنی کشکول گدائی کی "اسی بضاعت مزجاۃ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور ایسا کھڑا ہوا کہ پھر اس وقت تک نہ بیٹھا جب تک کہ ملت و دین کی تجدید کی جس نہر کو وہ جاری کرنا چاہتا تھا وہ جاری نہ ہو گئی۔ وہ جاری ہوئی اور اس کے بعد بھی جاری کیا بلکہ اور بڑھتی رہی چڑھتی رہی ——— تا اینکہ ایک صدی بھی پوری نہ گزرنے پائی تھی۔ کہ اس کی یہی تجدیدی نہر ایک بحر بیکراں کی شکل میں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی آفاق کے کناروں سے ٹکرانے لگی جس مغل بادشاہ نے "فقیہہ" کا زجریز در شمشیر" احمق" مشہور کیا تھا۔ خدا کی شان دیکھو کہ اسی کے تخت پر اسی کا حقیقی پوتا اس تجدیدی معرکہ کے بعد بیٹھتا ہے اور قرآن و حدیث تو بڑی چیزیں ہیں دینی و علمی حیثیت سے جس کا درجہ نسبتاً فروتر ہے یعنی فقہ اور فقہاء جنہیں اس کے دادا نے اپنی آنکھوں سے گرایا تھا انہیں وہ اپنے سر پر بٹھاتا ہے۔ آخر کون نہیں جانتا کہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے عہد میں "فتاویٰ عالمگیری" کے مدوّن کرانے کی خدمت انجام دلائی تھی۔ اور یہ تو عوام میں مشہور ہے۔ ورنہ اصل واقعہ تو یہ ہے۔ کہ

اکبر کا یہ پوتا فقہ کی اس کتاب کی تدوین میں عملی طور پر بذات خود شریک تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "انفاس العارفین" میں راوی ہیں کہ:-

فتاویٰ عالمگیری کی تدوین و تالیف میں عالمگیر کی شرکت

در آں ایام عالمگیر را بجمع و تدوین آں اہتمامے عظیم بود ملا نظام ہر روز یک صفحہ پیش پادشاہ مے خواندند۔ ص۲۴

ان دنوں میں عالمگیر کو اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں انتہا سے زیادہ اہتمام تھا۔ ملا نظام (افسر سررشتہ تدوین) روزانہ ایک صفحہ بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے تھے۔"

اس کے معنیٰ بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ کہ کتاب فتاویٰ عالمگیری اورنگ زیب کے صرف حکم یا روپیہ کی امداد ہی سے مرتب نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کی تدوین و تصحیح و ترتیب میں بنفس نفیس خود بادشاہ بھی شریک تھا علماء دن بھر مختلف کتابوں سے جزئیات اور مسائل کا انتخاب کرکے جب مرتب کر چکتے تو روز کا روز بادشاہ اسے سن لیتا تھا۔ کیا اس کا یہ سننا صرف بطور تبرک اور حصول ثواب کے تھا؟ شاہ صاحب نے اس کے بعد جو قصہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہر لفظ کے سمجھنے کے بعد آگے بڑھتا تھا۔ جو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس پر بحث کرتا تھا۔ شاہ صاحب نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ کے پدر بزرگوار نے فتاویٰ عالمگیری کے اس حصہ پر ان کے ایک دوست ملا حامد کے سپرد تھا ایک حاشیہ لکھ دیا تھا۔ ملا نظام (جو صیغۂ تدوین کے افسر اعلیٰ تھے) اور اپنے

رفقاء کار کے کاموں کو روز بادشاہ کے سامنے پیش کیا کرتے تھے جب دستور ملا حامد کے اس مسودہ کو سنا رہے تھے۔ کہ شاہ عبدالرحیم والے حاشیہ پر پہنچے۔ ملا صاحب کو تو اُدھر خبر نہ ہوئی۔ عالمگیر جس توجہ سے عالمگیری کے مسودات کو سنتا تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حاشیہ والے نامُنقرے کا کان میں پہنچنا تھا اور "ایں عبارت چیست" کی آواز شاہی جلال کے ساتھ ملا نظام کے کان میں گونجی۔ پھر ہوش وحواس کو درست کر کے غور کرتے ہیں۔ جب بھی مطلب خبط ہی نظر آیا۔ حتیٰ کہ اس وقت کچھ سمجھ[1] میں نہ آیا خفیف ہو کر معذرت خواہ ہوئے اور بولے :۔

ایں را مطالعہ نہ کردہ ام، فردا تفصیل عرض خواہم کرد | اس مقام کا میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے کل تفصیل سے اسکا مطلب عرض کرونگا۔

عالمگیری کارناموں میں مجدّدی اشارات کا دخل

افسوس کہ الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کی تفصیل کا آئندہ پھر موقعہ نہ مل سکے ورنہ تاریخی حقائق کی روشنی میں بتلایا جاتا۔ کہ

[1] اور وہ سمجھ میں آتا کیا۔ اس لئے کہ واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ ملا حامد نے ایک ہی مسئلہ کے متعلق دو کتابوں کی دو متفرق عبارتوں کو جمع کر کے عبارت میں گنجلک پیدا کر دی تھی۔ شاہ عبدالرحیم صاحب (والد حضرت شاہ ولی اللہ) کی نظر جب اس مقام پر پڑی، اصل کتابوں کو آپ نے دیکھا اور پیچیدگی کے منشاء سے واقف ہونے کے بعد مسودہ کے حاشیہ پر یہ عبارت لکھ دی من لو یتفقہ فی الدین قد خلط فیہ ھذا غلط وصوابہ کذا۔ یعنی دین کی سمجھ جو نہیں رکھتا۔ اس نے یہاں گڑبڑ کر دی۔ صحیح یوں ہے۔ ۱۲

عالمگیری تحریکات و مجاہدات میں حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ اور آپ کی تجدیدی ساعی کو کس حد تک دخل ہے۔ کم از کم حضرت مجدد کے فرزند مولانا شاہ معصوم کے وہ مکاتیب ہی پڑھ لئے جائیں جو مطبوعہ ہیں۔ تو ان سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ عالمگیر کے دنیاوی مہمات حتیٰ کہ جنگی اور سیاسی کارناموں میں بھی شاہ معصوم رحمتہ اللہ علیہ کے مشوروں بلکہ حکم کو کتنا دخل ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب کبھی اس مضمون کی تکمیل کا موقع میسر آئے گا۔ اس وقت اس مسئلہ کو بھی روشن کیا جائے گا۔
اسی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں۔ کہ "فتاویٰ عالمگیری" اور اس کی تدوین کا بادشاہ کو اتنا عظیم اہتمام بھی حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی کوششوں ہی کا ایک ثمر ہے۔ غالباً فقہ اور فقہی کتابوں میں یہ خصوصیت صرف فتاویٰ عالمگیری ہی کو حاصل ہے کہ ایک سلطنتِ کبریٰ (گریٹ امپائر) کا سب سے بڑا مطلق العنان بادشاہ اس کی تدوین و تالیف میں خود شریک رہا۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ جس تجدیدی عمل کی ابتدا جہانگیر سے ہوئی تھی اس کے عروج کا انتہائی کمال عالمگیر کی ذات پر ہوا۔ اور نسلاً بعد نسل سے تخت و تاج و اورنگ و دیہیم کے آغوش میں جس نے پرورش پائی ہو۔ تجدیدی عمل کے زور کو دیکھو کہ ایسے تلوار کے دھنی کے ہاتھ میں اس لئے قلم پکڑوا یا گیا کہ فلسفہ و منطق اور تفسیر و حدیث وغیرہ کے متعلق بھی نہیں بلکہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، بیع و شریٰ اور طلاق و نکاح کے خشک فقہی مسائل کی ترتیب میں خود شریک ہو۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دین کو اعزاز کا آخر اس سے بھی زیادہ بلند ترین مقام اور کیا مل سکتا تھا۔ قرآن لکھ کر اگر عالمگیر روزانہ آذوقہ مہیا کرتا تھا تو اس کی نظیر تاریخ سے مفقود نہ تھی۔ اسی دلّی کے تخت پر

نصیر الدین محمود بادشاہ اسی شان اور اسی التزام کے ساتھ سنا جاتا ہے۔ کہ بیٹھا تھا۔ لیکن فتہ جیسے غیر دلچسپ، دقیق و پیچیدہ علم کے ساتھ بادشاہ کی یہ دلچسپی میرے نزدیک دینی عزت کا آخری زینہ تھا۔

عُروج کے بعد نزُول

اب اگر اس عروج کے بعد کسی نزول کی پیشین گوئی کی جاتی تو تاریخ کے اوراق اس کی شہادت ادا کر سکتے تھے۔ دنیا کے پچھلے تجربوں سے اس کی توثیق ہو سکتی تھی جیسا کہ میں نے تمہید میں اشارہ کیا ہے کہ جمال کی تجلیوں کا جب کبھی ابتلائی حیات کے کسی عبوری دَور میں اتنا زور بندھا ہے تو تاڑنے والوں نے اس کے بعد "جلال" کے مظاہرہ کا ہمیشہ انتظار کیا ہے اور دنیا جانتی ہے کہ عالمگیر کی رحلت کے بعد ہی دوسرے رخ کا آغاز شروع ہو گیا تھا۔ "شورانگیزیوں" کی ساکن سطح میں پھر جنبش شروع ہوئی ——— اور "کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق" کے غیبی نقیبوں نے صلائے عام دینا شروع کیا۔

وہی دلّی جہاں کابل سے آسام اور نیپال سے ساحل سمندر تک کی زمین اور اس کے باشندوں کے تنہا مالک کو دیکھا گیا تھا کہ وہ مبسوط سرخسی حاوی قدسی، مضمرات تتارخانیہ وغیرہ فقہی کتابوں کی عبارتوں کو سننا اپنے لئے زادِ آخرت قرار دے رہا تھا۔ اسلام کے کلیات اور اساسی امور ہی نے نہیں بلکہ ان کتابوں کی جزئیات بعیدہ نے بھی عزت و احترام کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

وہی دلی ہے، دلی کا لال قلعہ ہے، لال قلعہ بابری و تیموری نسل کے پھولوں سے ابھی خالی نہیں ہُوا ہے۔ اسی دلی کا سب سے بڑا امام بلکہ سارے ہندوستان کے

مسلمانوں کا مسلم الکل پیشوا اسی دلی میں بیٹھا ہوا رو رہا ہے، اسلام پر رو رہا ہے، مسلمانوں پر رو رہا ہے۔ اور ان کی کھوئی ہوئی عظمتِ رفتہ پر رو رہا ہے۔

میری مراد شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہٗ العزیز سے ہے۔ اپنے چچا حضرت شاہ اہل اللہ کے نام عربی میں چند خطوط آپ نے لکھے ہیں۔ غالباً کسی مصلحت سے اس زمانہ کے تاثرات اور اپنے احساسات کا اظہار عربی نظم کی صورت میں فرماتے ہیں۔ میں ان نظموں کے چند اشعار بقدر ضرورت حاصل معنی کے ساتھ یہاں نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

شاہ عبدالعزیز کے خونیں آنسو یا نالہائے نیم شبی

جزی اللہ عنا قوم سکھ و مرہٹ
عقوبۃ شر عاجلا غیر اجل

اللہ سکھ اور مرہٹے کی قوم کو ہماری طرف سے بدلہ چکھائے۔ بہت برا بدلہ اور جلد چکھائے

وقد قتلوا جمعاً کثیراً من الوریٰ
ان دونوں نے بہت سی اللہ کی مخلوق کو قتل کیا۔

وقد اوجعوا اہل شاء وجاہل
اور بیچارے کمزوروں جاہلوں کو بھی انہوں نے دکھ پہنچایا

لہم کل عام نہبۃ فی بلادنا
ہماری بستیوں اور آبادیوں پر ہر سال لوٹ مار مچاتے ہیں

یغزون فینا بالضحیٰ والاصائل
اور ہمارے علاقوں میں دن رات اور شام کو پہنچتے ہیں

فہل ہنا من معاذ لعائذ
پھر کیا پناہ لینے والوں کیلئے یہاں کوئی جائے پناہ ہے؟

وہل من مغیث متقی اللہ عادل
ایسے کوئی ایسا فریاد رس اللہ سے ڈرنے والا انصاف کر سکتا ہو؟

ایک اور دوسرے خط میں جو ان ہی شاہ اہل اللہ کے نام ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ایام بردٍ اتت فالقلب منجزع   من قوم سکھ ان الخوف معقول
سردیوں کا موسم آگیا اور دل پریشان ہے   سکھ قوم سے اور دل کا یہ اندیشہ معقول ہے
انفاھم اللہ عن ھذہ البلاد یا رب عنھم   شر الاعادی وھم من جنۃ غول
خدا اس ملک سے ان کو ناپید فرمائے   بدترین دشمن ہیں اور خود یہ غول بیابانی ہیں
فوضت امری وامر الناس اجمعھم   الی اللہ وان الحفظ مامول
میں اپنے اور لوگوں کے معاملہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں   اور اللہ سے امید ہے کہ وہ حفاظت فرمائے گا

ایک اور تیسرے خط کے چند اشعار یہ ہیں :—

ثم ان البلاد فاسدۃٌ   عن ایادی الغشوم والظلام
پھر معلوم ہو کہ ملک تباہ و برباد ہے   ظالموں اور بدمعاشوں کے ہاتھ سے
غیر خافٍ علیک ما صنعت   قوم سکھ بجانب التوشام[1]
آپ پر غالباً مخفی نہ ہوگا جو کچھ کیا   سکھ قوم نے توشام علاقے میں؟
خفضوا کل قریۃ ومضوا   یفتحون الحصون والآطام
ہر بستی کو انہوں نے پست کر دیا اور گزر گئے   قلعے اور گڑھیاں فتح کرتے پھرتے ہیں
ضیعوا امۃ من الارواح   قتلوا امۃ من الاجسام
ایک گروہ کی جان انہوں نے ضائع کی   اور ایک طبقہ کے اجسام کو انہوں نے قتل کیا
نھبوا عدۃ من الاموال   اوثقوا عدۃ من الایتام
مال اندوزی کر کے بھگے ہیں —   اور بہادر کتنے یتیموں کو انہوں نے قید و بند کیا

---

[1] توشام، حصار کے ایک تعلقہ کا نام ہے - ۱۲

وسقوا کل من تعرضھم	من فنائم الأنام کاس الحمام
اسی کو پلا دیتے ہیں موت کا پیالہ	جو انسانوں کے گروہ میں سے ان کی راہ میں آڑے آئے
ذھلت کل رضع عمّا	ارضعتہ وکل ذات فطام
(آج) ہر دودھ پلانے والی	اس بچہ کو بھول چکی ہے جسے دودھ پلاتی تھی
	اور ان کو بھی جو دودھ چھوڑ چکے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اپنے ان اشعار میں ہندوستان کے جن سیاسی حالات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ تاریخ کی کتابیں ان کی تفصیلات سے معمور ہیں اور آئندہ بقدر ضرورت میں ان کا ذکر بھی کروں گا لیکن قصداً اس سلسلہ میں میں نے حضرت شاہ صاحب کی شہادت اس لئے پیش کی ہے تاکہ ایک عام غلط فہمی جو پھیلی ہوئی ہے۔ کہ علماء و صوفیاء کو ملک کے سیاسیات سے کوئی تعلق نہ تھا اس کا ازالہ ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے اسلاف کی خصوصاً اپنی تالیفات و تصنیفات میں یہ خاص خصوصیت تھی۔ کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہتے تھے اسی کو لکھتے تھے۔ بیچ بیچ میں اپنے زمانہ کے سیاسی جھگڑوں کا دکھڑا لے کر نہ بیٹھ جاتے تھے۔ اور غالباً غلط فہمی کا منشا بھی یہی ہے آخر یہی شاہ ولی اللہ ہیں۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے مولفات کے دفاتر طوامیر ہزارہا صفحات سے متجاوز ہیں۔ لیکن بجز "القاس العارفین" کے جس میں آپ نے اپنے آباؤ اجداد کے کچھ حالات درج کئے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں بلا ارادہ کہیں کہیں بعض سیاسی حالات کا بھی اجمالاً ذکر آگیا ہے۔ مگر اس کے سوا آپ کی کسی چھوٹی بڑی کتاب سے بمشکل اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی کتابیں ہیں

جا سوقت بکھی گئیں۔ جب نادرشاہ اپنی بے پناہ تلوار سے چاندنی چوک کی نہروں میں بجائے جمنا کے پانی کے انسانوں کا خون بہارہا تھا۔ تیموری کی مسجد زمین سے چھت تک لاشوں سے پٹی ہوئی تھی۔ قاضی کا حوض اور دلی کے عام کنوئیں صرف مُردوں سے بھرے ہوئے تھے سڑی ہوئی لاشوں سے پاک کرنے کے لئے دلّی کے ہر ناک پر بالا و یوڑا گیا تھا جس میں ہندو ہو یا مسلمان سب کی میت بلا امتیاز جھونکی جا رہی تھی۔ اور یہی ایک واقعہ کیا مرحوم اورنگ زیب کے بعد دلّی کے آسمان نے جن جانگداز، روح گسل واقعات کا تماشا کیا تھا اُن سے کون واقف نہیں ہے۔

دلّی کے خونین فتنے اور ولی اللہ کی استقامت

لیکن دیکھتے ہو! دھن کے پکوں کی اس شان کو دیکھتے ہو! بادشاہتوں پر بادشاہتیں گزرتی چلی جاتی ہیں انقلاب پر انقلاب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قومیں قوموں پر چڑھی چلی جا رہی ہیں فتنوں کا ہر طرف زور ہے فساد کا ہر طرف شور ہے۔ لیکن اللہ کے کچھ بندے ہیں جو سب کچھ دیکھتے ہیں سب کچھ سُنتے ہیں۔ سب سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور ہر مشکل کے حل کا ساز و سامان بھی اندر اندر تیار کرتے چلے جاتے ہیں لیکن ؎

اے مرغِ سحر عشق زِ پروانہ بیاموز
کاں سوختہ راجاں شد و آواز نیامد

نہ ان کی زبانوں پر آسمانوں کو ہلانے والی تقریریں ہیں، نہ آنکھوں سے جھوٹے آنسوؤں کا سیلاب بہایا جا رہا ہے، نہ رزولیوشنوں کے بم سے دشمنوں کے حصار پر گولہ باری کرکے فتح کے شادیانے بجائے جا رہے ہیں۔

نہ مخالفوں کی بے سروپا تجویزوں یا مشہور کیے ہوئے منصوبوں کو سن سن کر ان کا زہرہ ہوا جاتا ہے۔ وہمی اندیشیوں میں مبتلا ہو کر نہ ڈراؤنے خواب خود دیکھتے ہیں نہ دوسروں کو دکھاتے ہیں۔ نہ لایعنی بے معنی مشوروں سے مسلمانوں کو کبھی خیبر اور بولان کے دروں کی طرف بھگاتے ہیں ——— جس قوم کا فرض صرف آگے بڑھنا اور آگے بڑھتے ہی چلے جانا ہے۔ نہ اُن میں بزدلی اور جبن کے جذبات کی پرورش کر کے مورچوں کے چھوڑنے کا بگل بجاتے ہیں، نہ صرف پیٹ کی روٹی اور تن کے چیتھڑوں کو بچا لینے کے لئے اللہ کی مسجدوں کو، بزرگوں کے مآثر کو، آبا و اجداد کے مقابر کو، کفار کے مولیشیوں کے گوسالہ خانے پر اپنے کو راضی کرتے ہیں۔ کفر کی جن نسلوں کے متعلق امید تھی کہ آج نہیں تو کل جہنم کی آگ سے اُن کو بچا لینے میں ہم کامیاب ہوں گے۔ قیامت تک کے لئے ان پر ایمان کا دروازہ بند کر کے ہم اس لئے بھاگے جا رہے ہیں کہ جس طرح بے کتاب سے بے پیغمبر زندگی گزارنے والی قوموں کے سامنے روٹی کے چند ٹکڑوں کا سوال ہے اور اسی کا حل زندگی کے سارے معموں کا حل ہے۔ ہم بھی کوئی ایسا کونہ زمین کے کسی حصہ پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں جہاں ہمارے لقموں پر دوسری قوموں کے غرانے والے دکھائی تہ دیں۔ ہڈیوں پر اگر ہم لڑیں بھی تو آپس ہی میں لڑیں ایک لے دے کر اب "فرشتہ صید" "پیمبر شکار" "یزداں گیر" کے "شاہیں بچوں" کو اسی سردار

ف اور مشاہدہ کہو یا تجربہ وہ تو بنا رہا ہے کہ ان متکلم یہودوں "نان پرستوں" کا اگر کسی جگہ کو ڈ عافیت کا ایسا گوشہ کسی شکل میں میسر آ گیا ہے تو وہاں انہوں نے پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(باقی صفحہ پر)

پیٹ کے مسئلہ پر قناعت کر لینے کا مشورہ دیا جا رہا ہے "معاشی مشکلات" کی افیم کھلا کر ان پر غنودگی طاری کی جا رہی ہے۔ ان نوجوانوں کو کون بتا سکتا ہے جنہیں بجائے اپنے اسلاف کے اہل کفر کے بزرگوں پر ایمان لانے کی خود ہمارے گھر کے لوگ دعوت دے رہے ہیں۔ آج کیا وقت آیا ہے۔ اس سے پہلے جو گھڑیاں گزر چکی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں سچ تو یہ ہے کہ ابھی کچھ نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہمارے باپ دادوں کا شیوہ بولنے کا نہیں کرنے کا تھا محض اس لئے کہ وہ بولے نہیں تم غلط سمجھتے ہو اگر سمجھتے ہو کہ ان کو ان ضرورتوں کا احساس تھا جو چیز کردار میں تلاش کی جاتی ہے تم سے غلطی ہو رہی ہے کہ اسے گفتار میں ڈھونڈتے ہو۔ باتوں کی پیچیدگیاں باتوں سے حل ہو سکتی ہیں لیکن کام کی دشواریاں بجائے کام کے صرف باتوں سے حل ہوں۔ یہ اس زمانہ کا دستور نہ تھا۔ ان کے کاموں کا جائزہ لینا چاہتے ہو تو بجائے باتوں کے ان کے کاموں سے ہی تمہیں اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ان کے سامنے کیا تھا۔ اور اس کے لئے انھوں نے

بقیہ ص ۳۹ کے اسلام اور قرآن کی بلائیوں کو بالکل بھلا دیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد اور قرآن اسلام اور مسلمان کے الفاظ صرف اس وقت تک استعمال کرتے ہیں جب تک روٹی کے ان کے دو کرموں داروں کے مقابلہ میں ان ہی الفاظ سے چند لقموں کو اپنے پیٹ تک سرکانے میں یہ کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن جہاں اس مقابلہ کا خوف نکلا دیکھا جاتا ہے کہ پھر ان کے مسحور دماغ اس کھیل کو جاہلیت کے ان گوشوں میں کھیلنا چاہتے ہیں جو ان کا ملک ان سے کھلوانا چاہتا ہے وہی پردہ کی مخالفت، وہی مخلوط تعلیم، وہی رقص و سرود، وہی میخواری و قماربازی، سودی کاروبار وغیرہ کا جنون ان پر سوار ہو جاتا ہے۔ ۱۲

کیا کیا بجمل لکھے ؎

لعمدل طریق رندی از محتسب بیاموز
مست ست و در حقش او کس این گمان ندارد

بہر حال حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق بھی چونکہ میں بجائے اُن کی باتوں کے ان کے کام ہی کے ایک پہلو کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان کے اقوال کی جگہ میں بھی آپ کے سامنے ان کے اعمال کا ایک سرسری خاکہ پیش کروں گا اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے اقوال بھی پیش کرنا چاہتا تو "پروانہ سوختہ" کی راکھ سے میں ان جیسے نگاریکارڈ کیسے تیار کر سکتا ہوں۔ جو صرف "مرغ سحر" کے سوانح نگاروں کو مل سکتے ہیں۔ لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق آئندہ اپنے جس دعویٰ کو پیش کرنا چاہتا ہوں اگر بجائے آثاری شہادتوں کے صرف تحریری شہادتوں کا مجھ سے مطالبہ کیا جائے۔ تو اس مطالبہ سے عہدہ برآ ہونا شاید میرے لئے آسان نہ ہو۔ اگرچہ بڑی تلاش و تفتیش سے بعض جستہ جستہ چیزیں ان کی طویل الذیل تصنیفات میں مل ہیں اور انہیں کو میں آئندہ پیش بھی کروں گا۔ گو حضرت مجددؒ کے تجدیدی کارناموں کے کمال کے بعد جس زوال سے شاہ صاحب کو سابقہ پڑا ہے۔ قبل اس کے کہ عام تاریخی مواد اس کے متعلق پیش کروں۔ میں نے براہ راست ولی اللہی گھرانے کے ایک مشہور بزرگ بلکہ براہ راست بڑے صاحبزادے کی گواہی سے اسی لئے آغاز کیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ میں آئندہ حضرت شاہ صاحب کی طرف جن دینی وملی احساسات کو منسوب کروں گا۔ وہ محض میرا کوئی اختراعی نظریہ نہیں ہے

یا منطق کی اصطلاح میں دو اتفاقی قضیوں میں لزوم کے تعلق کو محض میرے حسن ظن نے نہیں پیدا کر دیا ہے۔

آخر اندازہ کرنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس باپ کا بیٹا، بیٹا ہی نہیں۔ بلکہ جانشین خلیفہ اور کیسا جانشین خلیفہ سمتاً و دلاً و ہدیاً جو ہو بہو اس کا مثنیٰ تھا۔ جب وہ اپنے سیاسی ماحول سے اس طرح متاثر تھا تو یہ کتنی بڑی غباوت ہو گی کہ حضرت شاہ ولی اللہ جیسے ذکی الحس، بیدار شعور، دقیقہ رس، نکتہ سنج، ژرف نگاہ باپ کے سینہ کو ان جذبات سے محض اس لئے خالی فرض کیا جائے کہ ان کی عام کتابوں میں ان احساسات کا سراغ نہیں ملتا۔ حالانکہ واقعتاً یہ بھی غلط ہے۔ جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا۔ لیکن منجملہ اور چیزوں کے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے یہ چند اشعار بھی اپنے اندر اس کی قوی شہادت رکھتے ہیں کہ "اسلامی ایوان" میں عہد عالمگیری کے بعد جو آگ لگی تھی۔ اس میں جن جن کے کلیجے بھنے تھے اور جن جن کے سینے آبلوں سے معمور ہو گئے اس میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان بھی تھا اور شاید یہی آبلے تھے جو "اسمٰعیلی جہاد" کے رنگ میں پھوٹ کر بالآخر بہہ گئے۔ اگرچہ اس "جہاد" کی روشنی پر پردہ ڈال دیا گیا تھا لیکن خدا جزائے خیر دے برادر عزیز محترم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کو جنہوں نے بزور اس پردہ کو "سیرت سید احمد شہید" لکھ کر حال ہی میں چاک کیا ہے۔ گو میں نہیں جانتا کہ جن لوگوں نے طے کر لیا ہے کہ بزرگوں کی روشنی کو نہیں دیکھیں گے اور جو قدم بھی اٹھائیں گے وہ مغربی لیمپ یا ہندی ڈیوٹ ہی کی روشنی میں اٹھائیں گے۔ ان کی نظر

بھی اس معیار پر پڑی یا نہیں۔
یا للعجب! "کُنتُمْ شُھَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" سارے جہان کے انسانوں کی نگرانی جس کے سپرد کی گئی اور جن کے وجود کا "اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" طغرائے امتیاز تھا۔ آج وہی اپنی ہر حرکت و سکون میں غیروں کی طرف تکتے ہیں اپنے کو بے بس پا رہے ہیں۔ حالانکہ ان کو جو مرکزی قبلہ مرکزی نبی، مرکزی کتاب دی گئی تھی۔ اسی سے اندازہ کرتے کہ اب سب کو ہمارے ساتھ وابستہ ہو کر جینا ہے۔ لیکن انہوں نے ان کے "چلانے والوں" نے تو طے کر لیا ہے کہ وہی دوسروں کی کمر پکڑ کر جئیں گے۔ اس کے سوا زندگی کی ساری راہیں ان پر مسدود ہو چکی ہیں —— وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ۔

عالمگیر کے بعد فتنوں کا آغاز

خیر میں کدھر نکلا جا رہا ہوں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ اورنگ زیب کے عہد کے بعد ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی تھی۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے توان واقعات کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے۔ اس اجمال کی تھوڑی تفصیل پہلے کر لینا چاہتا ہوں۔

سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک

اتنا تو ان اشعار سے بھی معلوم ہوا اور تقریباً سب ہی جانتے ہیں کہ عالمگیر کے بعد ہی ایک تحریک ہندوستان کے شمال مغربی خطوں میں "سکھ تحریک" کے نام سے اور دوسری تحریک جنوبی ہند میں مرہٹہ یا شیواجی کی تحریک کے نام سے اٹھی تھی۔ اور ثانی الذکر تحریک کا صرف آغاز ہی نہیں

لہ ایک حد تک اشتداد عالمگیر ہی کے زمانہ میں ہو چکا تھا۔ اسی کے ساتھ اجمالی
رپر لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دونوں تحریکیں سیاسی تھیں۔ اور ان
ونوں کا رُخ اسلام اور مسلمانوں کی طرف تھا۔ لیکن اگر قرآنی لہجہ میں پوچھا
ائے کہ المرھٹہ وما ادرٰئک ما المرھٹہ؟ یا السکھہ وما ادرائک
ا السکھہ؟ تو شاید اس سوال کے جواب کی جو واقعی ہیبت ناک، زلزلہ
گن ہوشربا تصویر ہے۔ وہ شاید ہی اس زمانہ کے مسلمانوں کے سامنے ہو!
چونکہ ان واقعات یا ان کے سوا بھی میں اور جن چیزوں کو پیش کر رہا ہوں
ن سے خود ان واقعات کا تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ دکھانا ہے
حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے قلبی واردات کا حال یہ ہے۔ کہ
وجود شاعر نہ ہونے کے جب اپنے باطنی احساسات سے مضطرب ہوتے تھے
اس وقت بیساختہ ان کی زبان یا قلم کی شورانگیزیاں ان اشعار کی صورت
ختیار کرتی تھیں ؎

زلف پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خود را — خورش درد دل شبہائی کردم چہ می کردم
لے پُردرد لمہاں انگارہ یا رنند خود دارم — جہاں را پر زیاری ہائی کردم چہ می کردم

آخر میں آپ کا مشہور مصرعہ ہے۔ ع

"جنون ترک منصبہا می کردم چہ مے کردم"

تو اس وقت جب کہ ہر معمولی سوار خاں اعتصام الدولہ، صمصام الملک،
خان دوراں اور امیر الامراء بن بن کر عزت وجلال کے اوج پر چمک رہا تھا
شاہ صاحب بقول خود کسی "جنون" میں مبتلا ہو کر سب پر لات مار کر اپنا عذر

ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"جنونِ ترکِ شکیبائی کردم چہ می کردم"

جلال کی جن تجلیوں کا تماشا فرما رہے تھے۔ ان ہی کو پیشِ نظر رکھ کر فرماتے ہیں ؎

جہاں وجاں فدائے وضعِ شوخِ شہر آشوبت
قیامت مے نمائی و درِ عیسیٰ و مرہم اہم

غور کرنا چاہئے۔ ایک ایسے وارفتہ وسستِ الست کے متعلق یہ خیال کرنا کہ جس طرح بہت سے لوگ جو محض اس لئے کہ لکھنا جانتے ہیں۔ کتابیں لکھتے تھے۔ اسی زمرہ میں شاہ صاحب یا شاہ صاحب کی تالیفی و تعلیمی خدمات کو شمار کرنا کم از کم میرے نزدیک "واقعات" کے عدم احساس ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے ورنہ سچ یہ ہے کہ اس گروہ کو جس کا سب سے بڑا کام صرف لکھنا ہے اس کو ان دل باختوں، سوختہ سامانوں سے کیا نسبت؟ جنہوں نے کسی بڑے کام کے لکھنے کا پیشہ اختیار کیا، ٹھیک جو حال مولانا روم کا ہے جن کا کام شاعری نہ تھا۔ لیکن ایک کام کے لئے انہوں نے شاعری کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ میرے نزدیک حضرت شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ کے تمام مساعی کا مرکزی نقطہ بھی یہی تھا۔ اور آئندہ آپ کے سامنے اسی نظریہ کی کچھ تفصیل پیش کی جائے گی۔ اسی لئے پہلے ان حالات کو پیش کرتا ہوں۔ جن میں حضرت شاہ صاحب گھر گئے تھے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ عہدِ عالمگیری کے بعد سب سے بڑے فتنے دو تھے۔ جن میں ایک کا مرکز پنجاب اور دوسرے

کا منشاء، دوسرا جنوبی ہند کا وہ ساحلی علاقہ تھا جسے عموماً کوکن یا مرہٹواڑی کہتے ہیں ۔ میں پہلے فتنۂ سکھ کا اجمالاً ذکر کرنا چاہتا ہوں ۔

پنجاب کی جدید خاکسار تحریک اور قدیم سکھ تحریک میں وجوہ مماثلت

یہ عجیب بات ہے کہ ٹھیک جس طرح پچھلے چند سالوں میں پنجاب ہی کی سرزمین سے ایک تحریک اٹھی جس کے آغاز میں یہ ظاہر کیا گیا کہ "مذہب" کے سمجھنے میں لوگوں کو جو غلطی ہوئی ہے ۔ محض اس کی اصلاح مقصود ہے اور اس سلسلہ میں آج تک تیرہ سو برس سے قرآن کا جو مطلب مسلمان سمجھتے تھے وہ بالکلیہ الٹ دیا گیا ۔ حتیٰ کہ جو کفر تھا وہ اسلام قرار پایا اور جو اسلام تھا وہ سر بسر کفر بن گیا ۔ بہرحال ابتداءً جس طرح یہ ایک مذہبی اصلاحی تحریک تھی لیکن چند ہی دنوں میں صاحب تحریک نے آہستہ آہستہ چولا بدلنا شروع کیا ۔ ایک آہنی اوزار کو مذہبی شعار کا رنگ عطا کر کے ماننے والوں کو مسلح کیا گیا ۔ پھر روپیہ کے ساتھ ساتھ چند دن میں گھوڑے، خیمے، وردیاں وصول ہونے لگیں ۔ اور بالآخر اچانک اس تحریک کا رُخ "سیاسیات" کی طرف پلٹ گیا ۔ حتیٰ کہ خون و قتال کی گرم بازاریاں بھی شروع ہو گئیں ۔ "غزاۃ" اور "شہداء" کی فہرستیں بننے لگیں ——— قریب قریب کچھ اسی شکل کے ساتھ پنجاب ہی سے "سکھ تحریک" کا آغاز ہوا تھا ۔ مفصل حال تو کتب تاریخ سے معلوم ہوگا یہاں صرف اتنا معلوم کر لینا بس کافی ہے ۔ کہ ایک لڑکا جس کے متعلق مصنف سیر المتاخرین

لے بیلچہ ۔

کا بیان ہے کہ :-

"پدرش لقالے از قوم کھتری بود۔ در عہد طفل حسنی وصلحتے باندک استعداد ولیاقتے خداداد داشت" سیر ص ۴۰۱/۲

چونکہ اس حسین وصبیح لڑکے کی طرف پنجاب کے ایک صوفی منش بزرگ سیّد حسن نظامی کی نظر خاص تھی۔ (براو نظر توجہ داشت) اس لئے "بفیض صحبت درویش حقیقت کیش فی الجملہ شعور ودانش بہم رسانیدہ وبرحقائق ومعارف کہ کتب فقرائے اسلام وصوفیہ ذوالاحترام بآں مشحون است اطلاعے حاصل نمود ——" اور اسی وجہ سے —— "ازبیش آبائی خود درگزشتہ مضامین اقوال آں بزرگواراں بزبان پنجابی کہ داشت دربحور اشعار ہندی موزوں می نمود"۔

آخر ان ہی اشعار نے "گرنتھ" کے نام سے ایک مذہبی کتاب کی شکل اختیار کی اور اس کے یہ مبلغ "گرونانک" کے نام سے مشہور ہوئے تو جس طرح گویا پنجاب کی موجودہ تحریک جیسے عہد حاضر کی قوت حاکمہ کے ادبیات سے متاثر ہوکر ابتداءً مذہبی رنگ میں شروع ہوئی ہے۔ اسی طرح پنجاب کی پہلی تحریک بھی اس زمانہ کی قوت حاکمہ کی تعلیمات سے متاثر ہوکر ابتداءً مذہبی ہی رنگ میں جاری ہوئی تھی —— البتہ موجودہ تحریک کے محرک اول ہی نے اپنے ہی زمانہ میں اس کا رُخ سیاسیات کی طرف پھیر دیا۔ لیکن پہلی تحریک نے محرکِ اوّل کے چند جانشینوں کے بعد اچانک سیاسی کروٹ لی۔

سکھ تحریک کی سیاسی کروٹ اور اس کے فروغ کے اسباب

ایسا کیوں ہؤا اور کن اسباب کے تحت ہؤا۔ اس کا قصہ تو طویل ہے لیکن اسی زمانہ میں جب حضرت شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہو چکے تھے۔ پنجاب کی یہ مذہبی تحریک مشہور گرو گوبند کی کوششوں سے سیاسی رنگ اختیار کر چکی تھی اپنی مذہبی تحریک کو سیاسی رنگ دینے کے لئے گورو گوبند نے بھی وہی کیا جو پنجاب کی موجودہ تحریک میں کیا گیا یا کیا جا رہا ہے۔ صاحب سیر المتاخرین لکھتے ہیں :۔

گورو گوبند بجائے پدر خود تیغ بہادر[1] نشستہ منتشران فرقہ خود را آہستہ آہستہ جمع نمود وسلاح واسپ ویراق بہم رسانیدہ و برہمراہیان خود قسمت کردہ واندک اندک

گورو گوبند نے باپ تیغ بہادر کی جگہ بیٹھ کر اپنے فرقہ کے پراگندہ اور منتشر افراد کو آہستہ آہستہ اکٹھا کرنا شروع کیا اور ہتھیار، گھوڑے اور دوسرے جنگی

---

[1] تیغ بہادر کے متعلق طباطبائی نے عجیب بات لکھی ہے کہ "شیوہ اخذ بجبر وتعدی اختیار نمودہ در پنجاب میگردد" لیکن اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے۔ کہ حضرت مجدد صاحب کے مشہور خلیفہ حضرت حافظ شیخ آدم بنوری نے بھی ایک جمعیت فراہم کی تھی اور" تیغ بہادر از ہندواں زر ہا می گرفت" اور حضرت شیخ کے متعلق لکھا ہے کہ "حافظ آدم از مسلمانان" طباطبائی اور ان جیسے "بزرگوں" کو حضرت مجدد سے جو خاص کد تھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اس کا نتیجہ ہے یا واقعی سکھی تحریک کے مقابلہ میں حافظ آدم رحمۃ اللہ علیہ بھی فی الحقیقت اٹھے تھے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے دوست مولانا یوسف بنوری جو غالباً حضرت حافظ صاحب کے خاندان سے ہیں اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے "مجددیت" کے سلسلہ میں اس سے ایک باب کا اضافہ ہوگا ۔ ۱۲

دست و پائے خود را دراز و شروع تگ و تاز نمود۔ ص ۴۰۲

سازو سامان بھی فراہم کئے اور اپنے رفقا پر سب کو تقسیم کرنے لگا۔ یوں تھوڑا تھوڑا کر کے اس نے اپنے پاؤں نکالنے شروع کئے۔ اور دوڑ دھوپ کی ابتدا کی۔

بہرحال گورو گوبند کے ساتھ تو" بموجب فرمان بادشاہ فوجداران حضور بنادیب او پرداختند" لیکن گوبند کا جانشین جب بندا نامی گورو ہوا اور اس وقت حضرت شاہ صاحب جوان ہو چکے تھے۔ اس نے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا ان چند الفاظ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے

مسلمانوں پر لرزہ خیز مظالم

بر ولایت و آبادی اہل اسلام ہر جا دست او مے رسید تا فتہ از سکنہ اینجا ہر کرا می یافت الفانی کرد۔ ہر چند اطفال صغیر السن باشند۔

اہل اسلام کے گاؤں اور آبادیوں پر جہاں کہیں قابو پاتا تھا چڑھ دوڑتا اور باشندوں میں جس کسی کو پاتا باقی نہیں چھوڑتا تھا خواہ چھوٹے کمسن بچے ہی کیوں نہ ہوں۔

قساوت و بطش شدید و جباریت کا یہ عالم تھا کہ

حتیٰ زنہائے حاملہ را شکم دریدہ وجنین را بیرون کشیدہ می کشتند

حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچہ کو باہر نکال کر مار ڈالتے تھے۔

یہ تو طبا طبائی کا بیان ہے۔ میرزا حیرت نے ایک ہندو مصنف کی جو

پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کے عہدہ پر مامور رہے حسب ذیل شہادت نقل کی ہے:۔

ایک ہندو مصنّف کی شہادت

مسلمانوں سے سکھوں کو بڑی دشمنی تھی۔ اذان یعنی بانگ باآواز بلند نہیں ہونے دیتے تھے۔ مسجدوں کو اپنے تحت میں لے کر گرنتھ پڑھنا اس میں شروع کرتے اور اس کا نام مست گڑھ رکھتے تھے۔۔۔ شکار اور شراب خور ہوتے تھے۔ گھوڑے پر چڑھے ہوئے روٹی کھاتے جاتے تھے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جہاں پہنچتے تھے جو برتن مٹی کا استعمالی کسی مذہب والے خصوصاً مسلمانوں کا پڑا ان کے ہاتھ آجاتا تھا پانچ چھتر (جوتے) اس پر مار کر اس میں کھانا پکا لیتے تھے۔

(حیات طیبہ صہ ۱۳۱)

مسلمانوں کے برتن کے پاک کرنے کا سکھوں نے جوتے مارنے کا عجب طریقہ اختیار کیا تھا۔ بہرحال اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بعید از قیاس کہا جائے اس واقعہ کو جو ان "شکار اور شراب خوروں" کے متعلق مرزا حیرت نے درج کیا ہے۔ کہ

زندہ جانوروں کے ہُولے

سکھوں کا دستور ہے۔ کہ وہ ہُولے کر کے کھاتے ہیں۔ دہلی میں ہولے سے کچے بوٹوں کو گھاس پھوس کی آگ میں مع شاخوں کے خستہ کرنے کو کہتے ہیں۔ مگر سکھوں میں انہیں ہولے نہیں کہتے۔ وہ ایک بڑے فولادی پنجرے میں چیل کوے۔ کبوتر۔ تیتر

میناٸیں، طوطے غرض مختلف قسم کے جانور بند کرکے پنجرے کو کسی درخت سے لٹکا دیتے ہیں۔ اور پھر نیچے آگ دے دیتے ہیں۔ وہ زندہ پرند پھڑپھڑا کے بھُن کے کوئلہ ہو جاتے ہیں۔ پھر انہیں صاف کرکے یہ ناخدا ترس کھاتے ہیں"۔

خیر یہ غریب پرندوں اور جانوروں کو ہولہ بنانے کی شکل تھی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ جب اسی کے بعد مرزا حیرت کی اس روایت پر نظر پڑتی ہے کہ :۔

انسانوں کے ہولے

"اسی طرح بے گناہ مسلمانوں کے ہولے کیے جاتے تھے۔ اور یوں تڑپا تڑپا کے انہیں مارا جاتا تھا" صث

بہرحال قتل و غارت، خونریزی و خونخواری اس تحریک کی روح تھی۔ دماغوں کو اتنا مسحور کیا گیا تھا کہ جب فرخ سیر نے اپنے زمانہ میں سکھوں کی ان ظالمانہ چیرہ دستیوں کا فی الواقع علاج کرنا چاہا اور عبد الصمد خاں تورانی صوبہ دار کشمیر اس مہم پر متعین ہوا جس نے بڑی دلیری سے بندا اور اس کے ساتھیوں پر قابو حاصل کرکے سب کو گرفتار کرکے دہلی روانہ کیا۔ بادشاہ کے پاس ہزارہا غریب و بے کس مسلمانوں کی فریاد و زاری کی عرضیاں پہنچی ہوئی تھیں۔ جب حکم دیا گیا کہ اب اُن سے انتقام لیا جائے۔ تو بقول طباطبائی اس وقت کا سماں عجیب تھا۔ لکھتے ہیں :۔

سکھوں را کہ حذیۂ قربانی انتصلے عجیب از آں جماعہ مسموع

شدہ کہ در کشتہ شدن یکے بر دیگرے سبقت مے جست و منّت جلّاد مے نمود کہ اول اورا بکشید۔ صہ۳ ج ۲

عجیب قسم کی سخت جانی اس گروہ کے متعلق سننے میں آئی یعنی ملے جانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا۔ جلاد کی خوشامد کرتا کہ پہلے اُسے مار ڈالا جائے۔

باطل کیلئے مرجانے اور حق پر جان دینے کا فرق

کتنی عجیب بات ہے۔ حق ہو یا باطل اس قسم کی قربانیوں اور دیدہ دلیریوں کے نظائر کی تاریخ میں کچھ کمی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو ہر چیز سے قطع نظر کر کے کسی کے تصلب و استقلال یا جذبۂ قربانی کو اس کی صداقت کی دلیل بنا لیتے ہیں۔ کس لئے مرا؟ یہ نہیں دیکھتے۔ بلکہ کسی بات پر ہٹ کرتے ہوئے مر جانا بس یہی ان کے نزدیک ان کے خیال کی صحت اور اس کے مسلک کی راستی کی کافی شہادت ہے۔ حالانکہ اگر حق و باطل کا یہی معیار ہے تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ابوجہل اور سید الشہداء حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یہ دیوانے کس بنیاد پر امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ آخر ابوجہل نے قربانی کی کون سی ایسی قسم تھی جو پیش نہیں کی۔ مال لٹایا، گھر چھوڑا در چھوڑا اور بالآخر اپنے مسلک پر اصرار کرتے ہوئے بدر میں پہنچ کر اسی راہ میں اپنی جان بھی دے دی پھر کیا واقعی محض اس لئے ابوجہل بجائے ابوجہل ہونے کے ابوالحکم قرار دیا جا سکتا ہے جس نے بھی اپنی جان دے دی۔ بس اس کے بلندیٔ رتبہ کا

ان کے سامنے پھر کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو ایک نہیں لاکھوں ہر زمانہ میں ہر مسلک میں آپ کو ایسے آدمی مل سکتے ہیں اور ملتے رہتے ہیں اور اس وقت بھی مل رہے ہیں۔ جو کسی بڑی چیز کے لئے نہیں صرف پندرہ روپے ماہوار کے لئے فوجوں میں اس لئے بھرتی ہونے پر تیار ہیں کہ جب جی چاہے اُن کی گردن ان کے سروں سے اتار لی جائے۔ پھر کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ فوج کا ہر سپاہی قربانی و ایثار، استقامت واستقلال کا پیکرِ مجسم اور مظہرِ اتم ہے؟ صرف اس لئے کہ بجائے کسی بڑے نصب العین کے عام فوجی سپاہیوں کے سامنے محض چند روپے ہوتے ہیں جن کے لئے وہ اپنی جانوں سے بھی دست بردار ہو جاتے ہیں۔ ان کی کوئی عظمت کسی دل میں نہیں پائی جاتی؟ یہی واقعہ ہے اور یہی فطرت کی شہادت ہے۔

بڑی جہالت ہے کہ کس لئے جان دی؟ اس سوال کی تحقیق کرنے سے پہلے لوگ غل مچا دیتے ہیں کہ فلاں نے جان دے دی۔ اب اس سے زیادہ اس کی راستبازی کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

آج بھی تحریکوں کی صداقت و عدم صداقت کا معیار جاہلوں میں صرف یہی چیز بنی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی کسی مسلک کی تصدیق اس لئے کی جاتی ہے کہ اس پر چلنے والے بڑے متقّلم ہیں، بڑے اولوالعزم ہیں۔ ہندوستان ہی نہیں ہندوستان کے باہر بھی اپنے خیال کے پرچار میں دیوانہ وار مارے مارے پھرتے ہیں کبھی کہا جاتا ہے کہ آخر جو نہ کسی سے کچھ لیتے ہیں اور نہ مانگتے ہیں۔ بلکہ اپنی جیب خاص سے اپنی وردیاں بناتے ہیں، بلّے خریدتے ہیں۔ کرایہ یا

بلاکوایہ ریل گاڑیوں پر سفر کرتے ہیں۔ ہر بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جانے پر ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ نہ اپنی جائدادوں کی انہیں کوئی پرواہ ہے نہ اپنی اولاد کی فکر "جان عزیز یہ" ہر وقت ان کی مٹھی میں دھری ہے۔ معمولی اشاروں پر اسے بآسانی پھینک دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہا جاتا ہے کہ آخر اس سے بڑھ کر ان کی سچائی اور خدا کی مرضی کے مطابق ہونے کی اور کیا دلیل تلاش کی جاتی ہے ــــــ میں یہ نہیں کہتا کہ بجائے خود یہ صفات اچھے نہیں ہیں۔ لیکن لکڑی کاٹنے کے لئے جسے تیشہ دیا گیا۔ اگر بجائے لکڑی کے وہ مسجد کی دیوار کھودنے لگے تو اس میں "تیشہ" کی برائی نہیں، استعمال کرنے والے کی غلطی ہے۔ سعدیؒ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن
نہ گفتم کہ دیوار مسجد بکن

آپ یہ نہ دیکھئے کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے۔ بلکہ یہ دیکھئے کہ وہ اپنے ہتھیار کو کن چیزوں پر چلا رہا ہے۔ تنظیم، اتحاد، ایثار، قربانی یہ قدرت کے اٹل قوانین ہیں۔ جن کے بغیر اپنے "نصب العین" کی تکمیل میں مشکل ہی کوئی کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر بذات خود ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر کسی اچھے بلند نصب العین کے لئے انہیں استعمال کیا جائے تو یہ بہترین چیزیں ہیں لیکن اگر شر و فساد، خونریزی و تباہ کاری، اضلال و تسویل، نوامیس شرعیہ کی توہین، اہل حق کی تحقیر کا ذریعہ ان ہی چیزوں کو بنایا جائے تو پھر ان صفات سے

زیادہ بدتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا چونکہ مجھے شمال مغرب کی قدیم تحریک اور جدید تحریک میں گونہ مشابہت نظر آرہی ہے۔ اس لئے ان چند اشارات کا ذکر مناسب معلوم ہوا ——— اب میں اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ سکھوں کے جس فتنہ کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ کو تو اس وقت یہ سنایا جا رہا ہے لیکن دین کے جس دیوالنے اور شمع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس پروانے کا نام "ولی اللہ" تھا۔ اسے یہ سب کچھ دکھایا جا رہا تھا۔ ٹھیک جن دنوں پنجاب بندا کی ترکتازیوں سے قیامت کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ اسلامی حکومت اس کا اور اس کے ساتھیوں کا تعاقب کرتی تھی۔ لیکن ۔

بندا مذکور کمتر مقابل افواج پادشاہی مے گشت۔ اکثر بطور چپاولی وقطاع الطریقی در اطراف وجوانب دویدہ یک جلے تمے آسودہ ہر جا قابو مے یافت، در قتل وغارت وتخریب مساجد ونبش قبور مسلمانان قصور نمے نمود۔

صفحہ ۴۰۲۔ طباطبائی ج ۲

مذکورہ بالا بندا بادشاہی فوج کا سامنا بہت کم کرتا تھا۔ بلکہ زیادہ تر گوریلا وار کے طور پر چھپ چھپا کے حملے کرتا تھا اور اطراف وجوانب میں راہزنی کرتے ہوئے پھرا پھرتا۔ ایک جگہ اپنا ٹھکانہ بنا کر نہیں رہتا تھا جہاں موقع مل جاتا قتل وقتال، لوٹ مار اور مسجدوں کی بربادی مسلمانوں کے مقابر کے اکھاڑنے میں کمی نہیں کرتا۔

بتدا کے یہ سانحے جس وقت دلی میں خود اپنے قتل میں منت جلاد میں سبقت کر رہے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ اس وقت دلّی ہی میں موجود تھے۔ اور یہ سارے واقعات ان کے سامنے گزر رہے تھے ان صفات کے زیر اثر جو تحریک اٹھائی گئی ہو عوام کو اس کی اہمیت کا ممکن ہے صحیح اندازہ نہ ہو لیکن جس نے حجتہ اللہ البالغہ اور خیر الکثیر ازالتہ الخفا جیسی ولی اللہی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے اور حضرت شاہ صاحب کی نگاہ عقابین کا اسے تجربہ ہے۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ ان حالات کو دیکھ دیکھ کر قرآن وحدیث کے اس عاشق جانباز پر کیا گزر رہی ہو گی مسلمانوں کے بھیانک انجام کی جو تصویر ان کے سامنے گھوم رہی ہو گی۔ ارباب بصیرت ہی اس کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ایک طرف پنجاب سے یہ آندھی اٹھی تھی اور بتدریج تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی سلطنت وحکومت کی قوتیں بھی اس کے مقابلہ میں بسا اوقات اپنے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور پا رہی تھیں کہ شیواجی کے دماغ نے "دکن" کا جو "لاؤ" جوڑا تھا۔ عالمگیر انار اللہ برہانہ کی بست سالہ مسلسل کوششوں سے اگرچہ وہ کبھی کبھی دَب دَب جاتا تھا۔ لیکن سچی بات یہی ہے جیسا کہ اسی طبا طبائی نے لکھا ہے۔ کہ

عالمگیر خود بنفس نفیس متوجہ دکن شد۔ و بست و پنج سال کامل در گوشمالی مرہٹہ صرف نمود۔ اما از نہادن بعض امرائے رکاب کبرائے	عالمگیر نے بذات خود دکن کی طرف رخ کیا اور پورے پچیس سال مرہٹوں کی گوشمالی میں صرف کئے لیکن شاہی رکاب میں جو امراء تھے۔ ان کی

اغراض خود انفصال ہنگامہ مرہٹہ نمی خواستند استیصال جماعۂ مرہٹہ صورت نہ گرفت۔	سستی و کاہلی سے جس میں ان کے اغراض پوشیدہ تھے یہ معاملہ کا قطعی فیصلہ نہ ہونے پایا۔ یا امراء اپنے ذاتی اغراض کے تحت مرہٹوں کے ہنگاموں کو ختم کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔
صفحہ ۹۲۳ ج ۳	

بلکہ اورنگ زیبی پنجۂ فولادیں کے دباؤ کے اُٹھ جانے کے بعد اس قوم کو صرف دکن اور کوکن ہی نہیں بلکہ تقریباً ہندوستان کے اکثر علاقوں میں تگ و تاز تاخت و تاراج کا کھلا میدان مل گیا" برگی" جو مرہٹہ غارتگروں کا کپکپا دینے والا نام تھا۔ اس سے ملک کے اکثر و بیشتر صوبے پامال ہو رہے تھے۔ خود دہلی پر اکثر مرہٹوں کے حملے ہوتے تھے۔ اور حکومت ان کے مقابلہ سے دن بدن اپنے کو عاجز پاتی چلی جا رہی تھی۔ یہ واقعات ہیں۔ جن سے عامی و خاصی سب ہی واقف ہیں۔

سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک کا ایک خاص فرق

لیکن اس سلسلہ میں ایک چیز قابل غور ہے کہ مغربی شمالی گوشہ سے جو فتنہ اٹھا تھا جیسا کہ بیان کیا گیا۔ ابتداءً اس کی شکل ایک مذہبی اصلاحی تحریک کی تھی اور غالباً انتقامی جذبات کے تحت اس نے سیاسی کروٹ لی — لیکن اسی کے مقابلہ میں جس تحریک کی ابتداء جنوبی ہند سے ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے کہ بجائے کسی مذہبی اصلاحی تحریک کے شروع ہی سے اس کا آغاز ایک

ایسی سیاسی تحریک کی شکل میں ہوا جس کا مقصد ہندوستان کو قدیم پراچین تہذیب کی طرف واپس لے جانا تھا۔ پنجاب کی تحریک کا تعلق عوام کے مذہبی خیالات کی اصلاح سے تھا اور چونکہ اس کا بانی ہندوؤں کی کسی اعلیٰ ذات سے نہیں بلکہ قوم کھتری سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے ہر طبقہ کے عوام اس میں شریک ہوتے تھے۔ صاحب سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ سکھ لوگوں کا دستور تھا۔ کہ

"ہر چند از فرق مختلفہ باشند ہر گاہ ایں مسلک اختیار نمایند اجتناب احتراز از ہم دگر بقاعدہ مستمرہ بضابطہ دیرینہ ہنود نمی کنند۔ اگرچہ انابعد فرق باشند" ص۴۰

لیکن جنوبی ہند کی تحریک کے بانی چونکہ شیوا جی سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان کا نسلی تعلق اودے پور کے راناؤں سے بتایا جاتا ہے۔ اس لئے شروع سے ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے اس میں شریک رہے۔ حتیٰ کہ آخر میں تو مرہٹہ تحریک کی عنان بالاجی المعروف بہ پیشوا کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ جو براہ راست کوکنی برہمن تھا۔

گویا آج جنوبی ہند سے جس تحریک کی ابتدار ہوئی اور بالآخر اس وقت تمام دوسرے صوبوں کی مختلف تحریکیں بھی دب دبا کر اسی میں ضم ہو چکی ہیں۔ اس تحریک کی خصوصیت بھی وہی ہے جو پہلے کی تھی۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی جن کی زندگی کا بڑا حصہ مرہٹواڑی میں گزرا ہے، اور اس قوم کے عادات و اطوار مقاصد اور منصوبوں سے جتنی زیادہ واقفیت اس مؤرخ کو

حاصل ہو سکتی تھی۔ دوسروں کو اس کے مواقع حاصل نہ تھے۔ وہ یہ لکھتے ہوئے کہ:۔

حق علیم است وکفیٰ بہ شہیداً کہ ایں ہمہ امور مطابق واقع نقلم آمدہ و تعصب و تصنع اصلاً دخلے ندارد۔

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ گواہ ہونے کے لئے وہ کافی ہے کہ (جو کچھ لکھا جارہا ہے) یہ سب کچھ وہی ہے۔ جو واقعات کے مطابق ہے تعصب یا بناوٹ کو اس میں قطعاً دخل نہیں ہے۔

مرہٹہ تحریک کے نصب العین کو ان الفاظ میں ادا فرماتے ہیں:۔

"[1]مخفی نماند کہ فرقتین مذکورتین نیتے دارند کہ ہرجا دست یابند وجوہ معاش جمیع خلق را بند کردہ بہ طرف خود می کشند و زمینداری مقدمی و عمل پٹواری گری ہم باقدیم نہ گذاشتہ۔ اساس ارتاں کارہائے مذکور را از بیخ و بن بر کندہ بنیاد دخل و تصرف خود قائم کنند"

"لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ دونوں فرقوں (مرہٹہ اور کوکنی برہمن) کی نیت یہ ہے کہ جہاں ان کو قابو حاصل ہو جائے۔ وہاں خدا کی ساری مخلوق کے ذرائع معاش کو بند کرکے اپنی طرف ان کو سمیٹ لیں۔ زمینداری مقدمی پٹواری کا کام ان پیشوں کو بھی پرانے لوگوں کے ہاتھوں میں انہوں نے باقی نہیں چھوڑا ہے جو بیچارے

---

[1] یہ ساری عبارت ان کی کتاب "خزانہ عامرہ" سے منقول ہے۔ طباطبائی نے بھی بجنسہ اپنی کتاب میں اس کو نقل کیا ہے۔ ۱۲۔

ان لوگوں کے وارث ہیں ان کی تو
جڑ نکال کر انہوں نے پھینک دی اور
سب پر اپنا کل دخل قائم کر لیا"۔

آخر میں ان کے "اندرونی منصوبے" کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں :-

مے خواہند کہ مالک تمام روئے زمین شوند	یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تمام روئے زمین کے مالک بن جائیں

اگرچہ بیچارے میر صاحب نے اس کے بعد اپنے ایمانی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ :-

"رزاق مطلق تعالیٰ شانہٗ کہ روزی رساں ہندو مسلمان است برائے رزق اصناف خلائق بر ہمیں زمین نوشتہ تمام ایں مملکت بر یک قوم چہ طور مسلم توانند ماند"۔	"رزاق مطلق اللہ تعالیٰ جو ہندو اور مسلمان دونوں کا روزی پہنچانے والا ہے۔ اسی نے ہر ایک کی روزی کا حصہ اسی سرزمین (ہند) میں مقرر فرمایا ہے۔ یہ سلطنت کسی ایک قوم کے فائدہ کے لئے کس طرح مخصوص کی جاسکتی ہے"۔

ہندوؤں کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں کا رُخ اور ان کا مقصد

لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جنوبی ہند سے شروع ہونے والی موجودہ سیاسی تحریک کو (جس کی قیادت عملاً اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں ہی کے

ہاتھ میں ہے) جو لوگ مغربی کلیات اور کالجوں کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اس بنیاد پر اس قوم کا گُن گایا جاتا ہے اور کم از کم اس کے وجود کا یہ فائدہ بتایا جاتا ہے کہ اسی کی بدولت سوتے ہوئے جاگ پڑے۔ ان کو غور کرنا چاہئے کہ اس میں کہاں تک حقیقت کا عنصر شریک ہے۔

کیا ہندوستان کی تقسیم سے ہمارے مرض کا علاج ہو سکتا ہے

اور اس کے بعد مجھے ان لوگوں سے عرض کرنا ہے جو اسی مسئلہ "رزق" کے حل کی یہ صورت نکال کر مطمئن ہونا چاہتے ہیں کہ ہم ملک کا کوئی گوشہ اپنے لئے الگ کر کے آباد ہو جانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر روز کی اس کھٹ کھٹ سے نجات مل جائے گی۔ اول تو جنگ جدال اور باہمی نزاع و فساد کے لیے صرف ہندو مسلمان کی تفریق کی ضرورت نہیں۔ چاہنے والے اگر چاہیں گے تو شیعہ سُنی کے مسئلہ میں بھی اس سے زیادہ خونریزیاں محض ایک لفظ "وہابی" وغیرہ وہابی یا "دیوبندی" "بریلوی" یا از ایں قبیل دوسری تقسیموں سے پھیلائی جا سکتی ہیں۔ پھر جن لوگوں نے مرض کا یہ علاج تجویز کیا ہے۔ مَیں اگر ان کے متعلق یہ باور کرتا ہوں کہ ان کی نظر دور نہیں پہنچی ہے تو کیا غلط سمجھ رہا ہوں۔ اور بالفرض مسلمانوں کے بانٹنے یا بٹوانے میں بانٹنے والی قوتوں کو کسی وجہ سے کامیابی نہ بھی ہو۔ لیکن جس کا نصب العین آج ہی نہیں بلکہ آج سے صدیوں پہلے یہ تھا کہ

"می خواہند کہ مالک تمام شئے زمین شوند"۔

"چاہتے ہیں کہ تمام روئے زمین کے مالک ہو جائیں"۔

آخر ان سے ہم کہاں تک بھاگ کر پناہ لیں گے۔ آپ ہندوستان ہی کے متعلق سوچ رہے ہیں کہ اس ملک کے کسی علاقہ میں ہمیں چین نصیب ہو سکتا ہے۔ اگر ان سے بالکل الگ ہو جائیں لیکن ہندوستان تو بقول ان کے "ہندواستھان" ہے جو "ہندواستھان" نہیں ہے۔ جب وہ بھی ان کے "تمے خا ہند" میں داخل ہے تو آخر سرف چلائے گی اور بٹوارہ کو جو ہر مرض کی دوا خیال کیا جا رہا ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ زندگی اور حیات کے قدرتی قانونوں سے محروم ہونے کے بعد محض لاشوں کے چہروں پر غازہ ملنے سے کسی کو زندہ نہیں خیال کیا گیا ہے۔ اور نہ ان سے زندگی کے آثار نمایاں ہو سکتے ہیں۔ ہمارے پاس ہماری کتاب میں ہمارے پیشوا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم میں جینے کے جو اصول بتائے گئے ہیں۔ ان سے کٹ کر جو باوجود ادعائے اسلام کے اپنی خود تراشیدہ تدبیروں کے ذریعہ سے جینا چاہتے ہیں میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے کو کس طرح زندہ رکھ سکتے ہیں۔"

بہرحال ایک طرف پنجاب سے سکھوں کا فتنہ تھا جو بڑھتے ہوئے بادل کی طرح مسلمانوں پر چھاتا چلا جاتا تھا۔ اور بیدردی سے بجائے پانی کے ان پر آگ برسا رہا تھا اور دوسری طرف جنوبی ہند کا مرہٹی سیلاب تھا۔ جس میں جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک کہ مسلمان اپنے ڈوبنے اور بہنے کا تماشہ دیکھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

مرہٹہ گردی | مرہٹے ملک میں اِس کنارے سے اُس کنارے تک جہاں تک پہنچ سکتے تھے پہنچ کر،

ہر جا آبادی یافت سوختہ و غارت کردہ بخاک برابر ساختہ۔ (سیر صفحہ ۴۷۵ ج ۲)	جہاں کہیں آبادی انھوں نے پائی اُسے جلا کر، لوٹ کر زمین کے برابر کرتے چلے گئے۔

حتیٰ کہ خود دلی کو اس وقت جس وقت شاہ صاحب کی عمر چونتیس سال کی تھی۔ اور کالکا کے میلہ کا تماشہ دیکھنے کے لئے ہندو مسلمان شہر سے باہر ہو گئے تھے۔ مرہٹوں نے

دلی پر مرہٹوں کی تاخت اور دوسری اسلامی بستیوں کی بربادی

از دحام عظیم نمودہ بخاطر جمع غارت نمودہ مال وافر اندوختہ	بلّہ کر کے ایک بڑی بھیڑ کیا اور باطمینان تمام دلی

شب نزدیک مزار خواجہ قطب الدین ماندہ صبح روز چہار شنبہ یوم العرفہ بینا بازار و دکاکین آبادی آں جا را سوختہ غارت نمودہ (صفحہ ۴۷۶)	کو لوٹا اور بہت دولت جمع کی رات جب تریب ہوئی تو حضرت خواجہ قطب الدین کاکی کے مزار کے پاس شب گزار کر صبح بدھ کے دن جو عرفہ کا دن تھا مینا بازار اور آبادی کی دکانوں کو آگ لگا کر بھسم کیا اور سب کو لوٹ کھسوٹ لیا۔

اور یہاں سے پلٹنے کے بعد مسلمانوں کی مشہور بستیاں

قصبۂ بڈھانہ و بڑوت و بالوڈھی رفتہ۔ ہر دو قصبہ را چناں کہ خواست غارت نمودہ از بیخ و بن برانگندہ	قصبۂ بڈھانہ، بالوڈھی گئے اور دونوں قصبوں کو جیسا ان کے جی میں آیا لوٹا غارت کیا اور ان آبادیوں کی بیخ و بنیاد اکھاڑ دی۔

عید قربان کے دن مسلمانوں کی قربانیاں

گویا ٹھیک عید الاضحیٰ کے دن مسلمانوں کی قربانیاں کرکے یہ اپنے حرص و آز کے دیوتاؤں کو خوش کر رہے تھے سوچنے والے سوچ سکتے ہیں کہ اس ماحول میں اور دین کا جو حال ہوگا وہ تو بجائے خود، لیکن جس سینہ میں "اطیب النغم" کا سوز بھرا ہوا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ کے اس حال کو دیکھ دیکھ کر سن سن کر ان پر کیا گزرتی ہوگی؟

حضرت شاہ صاحب کا ایک تاریخی خواب

کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس مشہور خواب میں جس کا تذکرہ "فیوض الحرمین" میں آپ نے فرمایا ہے، ان احساسات کو دخل نہ تھا۔ درحقیقت اسی سلسلہ میں آپ کی آرزوؤں اور ہمت و دعا کی توجہات ہی نے عالم مثال میں یہ شکل اختیار کی تھی۔

فیوض الحرمین کے پڑھنے والے تو اس خواب سے واقف ہیں لیکن نہ پڑھنے والوں اور نہ جاننے والوں کے لئے میں بجنسہٖ اصل عبارت کے ساتھ درج کرتا ہوں، فرماتے ہیں:-

رأیتنی فی المنام قائم الزمان اعنی بذلک ان اللہ اذا اراد شیئاً من نظام الخیر جعلنی کالجارحۃ لاتمام مرادہ ورأیت ان	میں نے خواب میں اپنے کو دیکھا کہ میں قائم الزمان ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بھلائی اور خیر کے کسی نظام کو قائم فرمانا چاہتا ہے تو اس وقت مجھے اس مقصد کی

ملك الكفار قد استولى
على بلاد المسلمين ونهب
اموالهم وسبا ذريتهم و
اظهر في بلدة اجمير شعائر
الكفر وابطل شعائر الاسلام
(والعياذ بالله) فغضب الله
تعالى على اهل الارض غضبًا
شديدًا ورأيت صورة هذا
الغضب متمثلة في الملاء
الاعلى ثم ترشح الغضب
الى ثم انتشر غضبا فامن
جهة نفث من تلك
الحضرة في نفسي لا من
جهة ما يرجع الى هذا
العالم ورأيتنا ساعتئذ في
جمع عظيم من الناس منهم
الروم ومنهم الازبكية و
منهم العرب بعضهم ركبان
الابل وبعضهم فرسان و

تکمیل کے لئے گویا ایک آلہ اور
واسطہ بنائے گئے ہیں اور میں نے دیکھا
کہ کفار کا راجہ (یا بادشاہ) مسلمانوں کے
بلاد پر مسلط ہوگیا۔ اور ان کے اموال
کو اس نے لوٹ لیا ان کی عورتوں اور
بچوں کو گرفتار کرلیا اور اجمیر شہر میں
اس نے کفر کے شعائر کا اعلان کردیا۔
شعائر اسلام کو اس نے مٹا دیا (خدا کی پناہ)
پھر اس کے بعد یہ دیکھا کہ زمین کے باشندوں پر
حق تعالے غضبناک ہوئے اور سخت
غضبناک اور میں نے حق تعالی کے غصہ
کی صورت کو ملاء اعلی میں متمثل ہوتے ہوئے
دیکھا پھر وہاں سے ٹپک ٹپک کر وہی الہی
غیظ میرے اندر اترا پھر میں نے اپنے کو
غضبناک پایا اور یہ غضب جو مجھ میں بھر
گیا تھا حضرت الہیہ کی طرف سے مجھ میں دم
کیا گیا تھا اس کا منشا کوئی ایسی چیز نہ تھی
جس کا تعلق اس عالم سے ہو اور میں نے
اس وقت اپنے کو ایک بڑے مجمع میں پایا

بعضهم مشاة على اقدامهم و
اقرب ما رايت شبيها بهؤلاء
الحجاج يوم عرفة و
رايتهم غضابا لغضبي
وسألوني ماذا حكم الله
في هذه الساعة قلت
فك كل نظام قالوا الى
متى قلت الى ان تزدني
قد سكنت غضبي فجعلوا
يتقاتلون بينهم و
يضربون اليهم فقتل
منهم كثير وانكسرت
روس ابلهم وشفا
ههاثم اني تقدمت
الى البلدة اخربها و
اقتل اهلها فتبعوني في
ذلك وكذالك خرمنا
بلدة بعد بلدة حتى وصلنا
الاحمير وقتلنا هنا الك

جس میں روم والے بھی درانی بھی
ترک بھی اور عرب بھی اور بعض ان میں
اونٹوں کے سوار تھے اور بعض اسپ سوار
اور بعض پیدل، قریب قریب اس گروہ
کی حالت ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے عرفہ کے
دن حجاج کی ہوتی ہے پھر میں نے ان
لوگوں کو بھی اپنے غضبناک ہونے کی وجہ سے
غصہ میں بھرا پایا۔ ان لوگوں نے مجھ سے
پوچھا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے
میں نے کہا کہ "ہر نظام اور آئین کو توڑ دینا"
یہی حکم ہے۔
انھوں نے دریافت کیا یہ حال کب
تک رہے گا؟ میں نے کہا کہ اس وقت
تک جب تک تم میرے غصہ کو ٹھنڈا ہوتا نہ پاؤ
پھر وہ باہم آپس میں لڑنے لگے اور جانوروں
کو مارنے لگے پھر ان میں سے بہت سے
مارے گئے ان کے اونٹوں کے سر ٹوٹے
اور لب چور ہوئے پھر میں ایک شہر کی طرف
اسے برباد کرتے ہوئے اور اس کے

الكفار واستخلصناها منهم وسبينا ملك الكفار ثم رأيت ملك الكفار يماشي مع ملك الاسلام في نفر من المسلمين . نام ملك الاسلام في انشاذ لك بذبحه فبطش به القوم وصرعوه وذبحوه بسكين فلما رأيت الدم يخرج من اوداجه مندفقا قلت الان نزلت الرحمة ورأيت الرحمة والسكينة شملت من باشر القتال من المسلمين وصاروا مرحومين فقام الي رجل وسالني عن المسلمين اقتتلوا فيما

باشندوں کو قتل کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ لوگ میرا ساتھ دیے رہے تھے۔ یوں ہی ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کو تباہ و برباد کرتے ہوئے ہم بالآخر اجمیر پہنچ گئے۔ اور وہاں ہم نے کفار کو قتل کیا۔ پھر میں نے کفار کے بادشاہ کو دیکھا کہ وہ اسلام کے بادشاہ کے ساتھ مسلمانوں کے ایک گروہ میں ساتھ ساتھ چل رہا ہے اتنے میں اسلام کے بادشاہ نے کفار کے بادشاہ کے متعلق حکم دیا کہ اسے ذبح کر دیا جائے لوگوں نے اسے پکڑ کر دے پٹکا اور چھری سے اسے ذبح کر دیا۔ میں نے جب دیکھا کہ اس کی گردن کی شہ رگوں میں سے خون اچھل اچھل کر نکل رہا ہے تب میں نے کہا اب رحمت نازل ہو گئی اور میں نے دیکھا کہ یہ جو مسلمانوں میں لوگ جنگ میں شریک تھے انکو اس رحمت وسکون نے

بینھم فتوقفت عن الجواب ولم اصرح	احاطہ کرلیا اوران پر رحم کیا گیا پھران میں سے ایک آدمی اٹھ کر میرے پاس آیا اوران مسلمانوں کے متعلق پوچھا جو باہم لڑتے تھے میں جواب میں خاموش ہو گیا اور کوئی تصریح میں نے نہ کی۔
ص ۹۰-۸۹	

شاہ صاحب عام طور پر اپنے خوابوں کے آخر میں تاریخ درج نہیں کرتے۔ لیکن اس خواب کی تاریخ لکھی ہے اسی طرح ایک اور خواب جس کا ذکر آئندہ آئیگا اس میں انہوں نے یہی کیا۔ بہرحال اس خواب کی تاریخ انہوں نے یہ درج کی ہے:۔

رائیت ذلک فی لیلۃ الجمعۃ الحادیۃ والعشرین من ذی القعدہ سنہ ۱۱۴۴ھ	میں نے یہ خواب شب جمعہ ۲۱ ذی قعدہ سنہ ۱۱۴۴ھ کو دیکھا۔

شاہ صاحب کے اس خواب کی تعبیر پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ

ٹھیک اس تاریخ سے ۲۹ سال بعد یعنی سنہ ۱۱۷۳ھ میں اپنی وفات سے تین سال پہلے اسی شخص نے جس نے گزشتہ بالا واقعات کو خواب میں دیکھا تھا اپنے سر کی آنکھوں سے وہی شخص ایک اور واقعہ دیکھتا ہے جس میں بجائے اجمیر کے اگر دلّی کا لفظ شامل کر دیا جائے تو تقریباً جو کچھ خواب میں دیکھا گیا تھا بیداری میں "کفلق الصبح" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر اسی کا معائنہ کرایا گیا اس سے

تیسرا اشارہ پانی پت کے مشہور فیصلہ کن معرکہ کی طرف ہے جو تاریخوں میں مرہٹہ اور ابدالی کی جنگ سے موسوم ہے چونکہ "ہندوستانی تاریخ" کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں یہ واقعہ یا اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور مذکور ہے اس لیے تفصیل کی تو یہاں گنجائش نہیں لیکن سیر المتاخرین جو تقریباً تمام پچھلی تاریخوں کا ماخذ ہے اسی سے بعض جستہ جستہ فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

خواب اور بیداری کے واقعات کا انطباق

میں نے جو یہ کہا کہ بجائے "اجمیر" کے دلی فرض کی جائے یہ بھی محض فرض نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے "خالص اسلامی مرکز" کو کفر کے احاطے میں جو نکہ بٹھانا مقصود تھا اور دلی کو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے۔ جس طرح اسلامی بادشاہوں نے اسے دارالسلطنت بنایا تھا ہندوؤں کا قدر پرست بلکہ "ہستناپور" دلی ہی کے کھنڈروں میں موجود ہے اور آج "رائے سینا" بھی دلی ہی کے اطراف میں موجود ہے علاوہ اس کے "دلی" زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کا مرکز تھی لیکن ہندوستان میں مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ اسلام کا سب سے پہلا مرکز تو وہی ہے۔ جہاں سے ولی الہند یا بقول عوام ہند الولی حضرت خواجہ بزرگ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

کرد از "اجمیر" کار را بیدار
بے کتاب بے پریس و مدرسہ

اور یہ قرآن کے لئے کہہ رہا ہوں جو نہیں دیکھتے ہیں، یہ جو اس محسوس نظام کو کسی غیر محسوس نظام کے ساتھ وابستہ پا رہے ہیں، وہ مانتے ہیں

کہ "اجمیر" کا تعلق ہندوستان کے محیط سے کیا ہے۔ خیر کسی وجہ سے بھی سہی آپ اجمیر کی جگہ دلی پڑھ لیجئے۔ اور اس کے بعد مؤرخین نے ابدالی اور مرہٹوں کی اس فیصلہ کن جنگ کا جو حال لکھا ہے اسے پڑھئے، پھر اندازہ کیجئے کہ ۱۱۴۴ھ میں جو کچھ خواب میں دیکھا گیا تھا کیا اسی کا ۱۱۷۳ھ میں مشاہدہ نہیں کرایا گیا شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ پہلے میں نے دیکھا کہ ملک الکفار مسلمانوں کے بلاد پر مسلط ہو گیا اور ان کے اموال کو اس نے لوٹ لیا اور ان کی اولاد کو قید کر لیا۔ طبا طبائی لکھتے ہیں:

لال قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ

نو ذی حجہ سال مذکور ۱۱۷۳ قلعہ لال قلعہ بدست بھاؤ افتاد و حرم سرائے شاہی و جمیع کارخانجات سلطنت باختیار مرہٹہ رفت۔ خلاصۃ التقدیر العزیز العلیم ص ۹۱۲ ج ۲

نویں ذی حجہ ۱۱۷۳ھ میں لال قلعہ بھاؤ (سپہ سالار مرہٹہ) کے قبضہ میں چلا گیا اور شاہی حرم سرا کے ساتھ۔ سلطنت کے تمام کارخانے مرہٹوں کے تصرف میں آگئے۔ یہ عزیز علیم کا نوشتہ تھا۔

آگے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اجمیر شہر پر اس کا قبضہ ہو گیا اور کفر کے شعائر کا اس نے اعلان کیا، اسلامی شعائر کو ختم کر دیا۔ طبا طبائی کے یہ الفاظ ہیں:۔

لہ مجھے سلطانی ہمراہ تحریر میں "تقطعتر امراہم بینہم زبراً" پر میری گفتگو گراں گزرے وہ باوجود جشتی سلسلہ سے ہونے کے یہ دعویٰ رکھنے کہ اس بلدۂ پاک سے وہ تعلق رکھنا نہیں چاہتے یا نہیں رکھتے جو حضرت شاہ صاحب کو اپنے اس خواب میں "اسلامی مرکز" کے رنگ میں دکھایا گیا ہے۔ مگر میں کیا کروں جو حق ہے اس کا اظہار کرتا ہوں اپنے ان محسنوں کو کیسے بھول جاؤں جن کے صدقہ میں ہندوستان کو اسلام کا حصہ ملا ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

بہاؤ قلعداری شاہ جہان آباد
بناردشنکر برہمن تفویض کرد۔ و
جمعے را بہ حراست قلعہ ہمراہ او کرد۔

بہاؤ (سپہ سالار مرہٹہ) نے شاہجہان آباد
(دہلی) کی قلعہ داری ناروشنکر برہمن کے
سپرد کر کے ایک فوجی دستہ کو قلعہ کی
حفاظت کیلئے اس کے ساتھ چھوڑ دیا۔

اس سلسلہ میں "بہاؤ" جب یہ چال چلا کر اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے اودھ کے شجاع الدولہ کو اپنے ساتھ ملا ناچاہتے تھے اور مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے ایک شاگرد برہمن کو اس مہم پر شجاع الدولہ کے پاس بھیجا تو اس وقت شجاع الدولہ نے جو جواب دیا۔ وہ مرہٹوں کی بھی اور شاہ صاحب کے خواب کی بھی کامل شرح ہے شجاع الدولہ نے جواباً کہا:۔

از مدتے براہمہ دکھن بر ہندوستان
مستلط شدہ اند۔ بعادار آبرو و رفاہ و
آسائش احدے از خلق خدا
نیستند۔

ایک زمانہ سے دکن کے برہمن ہندوستان
پر مسلط ہو گئے ہیں اور یہ لوگ خلق اللہ
میں سے کسی کے آرام و آسائش اور
فارغ البالی کے روادار نہیں ہیں۔

اور آخر میں ان "براہمہ دکن" کی اس عجیب خصوصیت کا اظہار کیا ہے:۔

ہمہ را برائے خود و اقوام خود می
خواہند۔ مردم از دست ایشاں بجان
آمدہ

سب کو اپنے لئے اور اپنی قوم کے لئے
محکوم بنانا چاہتے ہیں۔ لوگ ان کے
ہاتھوں جاں بلب ہیں۔

خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ مجھے تو شاہ صاحب کے خواب سے غرض ہے یعنی مسلمانوں پر ملک الکفار کے غلبہ کو جس شان سے انہوں نے دیکھا تھا آپ

دیکھ رہے ہیں کہ من وعن وہی صورت پیش آرہی ہے۔ "لال قلعہ" پر جس وقت مرہٹوں کا قبضہ ہوا ہے تو "نہب اموال" (لوٹ مار) میں کس حد تک وہ پہنچے تھے اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ :۔

تنگ ظرف مرہٹوں کی لُوٹ مار کی ذلیل نوعیّت

دنائت و تنگ چشمی بہاؤ بمرتبہ بود کہ سقف دیوان خاص پادشاہی را کہ از نقرہ مینا کار بود کندہ مسکوک ساخت و طلا آلات و نقرہ آلات مزارات اقدام نبوی بمقبرہ نظام الدین معروف بہ اولیاً مرقد محمد شاہ مثل عود دسوز و شمعداں و قنادیل وغیرہ طلبیدہ مسکوک نمود۔

سیر المتاخرین ص ۹۱۲ ج ۲

بہاؤ کی پست نظری اور تنگ چشمی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ دیوان خاص کی چھت جس کی مینا کاری چاندی سے کی گئی تھی۔ اس کی سب چاندی کو کھرچ کر اس نے سکہ بنا لیا۔ اور طلائی آلات چاندی کے ظروف جو قدم رسول کی زیارت گاہ اور حضرت نظام الدین کے مقبرہ اور محمد شاہ کے مرقد میں تھے مثلاً عود سوز شمعدان قندیل وغیرہ کو اس نے سکہ بنا لیا۔

مرہٹوں کی اس تنگ نظری کا ذکر آزاد بلگرامی نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:۔

رسوم حقداران دہات مثل مقدم و پٹواری و نجار و گازر و حجام و حداد وغیرہم را ضبط نمودہ

دیہات کے رسوم کے پرانے حقدار مثلاً مقدم پٹواری بڑھئی دھوبی حجام لوہار سب کے حقوق کو ضبط کر لیا تھا۔

اور صرف "ضبط" نہیں کیا گیا بلکہ ان سب کو بھی ٹھیکہ پر لگا دیا گیا۔

بہ مستاجران دادہ مبالغ خطیرے
ازیں وجہ داخل خزانہ حضور می شد

ٹھیکیداروں کو دیدیئے گئے تھے)
اور بڑی بڑی رقمیں اس راہ سے ان کے
حضور کے خزانہ میں داخل ہوتی تھیں)۔

حالانکہ یہ ریاست کے یہ معمول تقریباً ہزار ہا سال سے چلے آتے تھے۔ اور اب بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ان موروثی حقوق میں کسی نے دست اندازی نہیں کی ہے۔ نقطۂ نظر کے اس اختلاف کا کیا علاج ہے کہ طباطبائی صاحب تولے "وراثت" رنگ حیثی پر شمار کرتے ہیں لیکن حسن ظن سے کام لینے والے اسی کو "معاشی رعایات اور [illegible]" بلند نظری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ غلام علی نے اسی "ملک الکلام" کا ذکر کرتے ہوئے اس سے کہا:

بالاجمال درباب اقتدار سلطنت
ہنود دکن بمرتبت آوردہ بود۔ تا آن
باجرہ می خوردند آنان گندم [illegible]
بادنجان خام و انجیر و [illegible] خام
برغبت تمام خوردند۔

بالاجمال ان اقتدار کے بارہ میں کہ
دکن اور ہندوستان کی سلطنت پر
اس کا قبضہ ہو گیا تھا۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ان سب چیزوں کو بڑی
رغبت سے کھاتا تھا۔

ان عجیب و غریب [illegible] عجیب و غریب باتوں کا ظہور جب اس زمانہ میں ہو رہا تھا [illegible]

ے کر سکتے ہیں [illegible] شکست [illegible] ۱۲

نفس کشی ہے یا نفس پرستی؟ میر غلام علی کو تو ان حرکات کے پیچھے جو "چیز" نظر آئی تھی وہ ان ہی کی زبانی سنئیے۔ ممکن ہے آپ کو یا مجھے اس سے اتفاق نہ ہو لیکن بطور نقل اس کے ذکر میں کیا حرج ہے۔ فرماتے ہیں:۔

چوں اصل پیشہ براہمہ گدائی ست	چونکہ برہمنوں کا اصل پیشہ دریوزہ گری
در کیش ہنود این مقرر شدہ کہ صدقات	ہے۔ ان کے دھرم کی مانی ہوئی بات
را بہ براہمہ باید داد طبائع آں قوم نسلاً	ہے کہ ہر قسم کے دان پن برہمنوں کو ہی
بعد نسلٍ بدریوزہ گری معتاد شدہ است	دئیے جائیں اس کی وجہ سے نسلاً بعد
و طماعی و ابن الغرضی لازم ماہیت	نسل اس قوم کی سرشت میں ابن الغرضی
برہمنی گردید بنابریں باوجود حصول	بطور لازم ماہیت کے شریک ہو گئی
مرتبہ سلطنت و امارت شیوہ گدائی	ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ سلطنت
از طینت آں ہا بدر نمی رود۔	اور حکومت کے درجہ تک پہنچنے کے بعد
	بھی ان کی فطرت سے شیوۂ گدائی
	الگ نہ ہو سکا۔

خود اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ:۔

ہر محلے کہ بحکام و متصدیاں	کسی قوم کا کوئی حاجتمند جب ان مذکورہ
براہمہ مذکور رجوع کند نظر آنہا ہمیں کہ	بالا برہمنوں کے حکام اور کارندوں کی
برائے ما چہ آوردہ و ہر چہ برسر دوراد	طرف رجوع کرتا ہے تو ان حکام اور
پابند کشیدہ گرفتہ برآں کار او حوالہ العلم	کارندوں کی نظر اسی پر ہوتی ہے کہ
مے کنند۔	ہمارے لئے وہ کیا لایا ہے۔

جو کچھ اس بچارے کے پاس ہوتا ہے اُسے بھی گھسیٹ لیتے ہیں اور اس کے کام کو دنیا کے حوالہ کرتے ہیں ۔
آخر میں داد دیتے ہوئے ایک شعر بھی درج فرماتے ہیں ؎

بدست خلق عالم کاسۂ دریوزہ می بینم
گدا چوں پادشاہ گردد گدا سازد جہانے را

(یعنی میں دنیا کی مخلوق کے ہاتھ میں بھیک کا پیالہ ہی دیکھتا ہوں گدا جب بادشاہ ہو جائے تو سارے جہاں کو گدا بنا کر رہتا ہے)

خدا جانے میر صاحب طب کے ماہر تھے یا نہیں لیکن اس کے بعد انہوں نے جو لطیفہ درج کیا ہے ممکن ہے کہ اطباءً اس کی تصدیق کریں فرماتے ہیں ان عادات واطوار کی ایک دوسری توجیہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ :-

مدار غذائے آنہا خواہ غنی باشد	ان کی خوراک کا دارومدار خواہ امیر ہو
یا فقیر بر دال تورا است وبا ایں دال عملے	یا فقیر صرف تور (ارہر) کی دال پر ہے
از روغن کہ آں را در ہندی بگھار گویند	اس دال کے ساتھ روغن ڈال کر جو تدبیر
نی کنند و از خارج نیز روغن بکار نمی برند	کی جاتی ہے جسے ہندوستان میں بگھار
کہ ہوستش را اصلاح نماید و احیانا اگر	کہتے ہیں یہ لوگ اس عمل کو دال کے
کسے بخورد ذاتی قلیل مرتبہ الیست کہ گویا نخورد	ساتھ نہیں کرتے علاوہ اس کے باہر
و مرچ سرخ و حلتیت و زرد چوبہ ہم	سے بھی روغن اس میں شریک نہیں

لہ اس مرچ سرخ کے متعلق میر صاحب سے ایک اور عجیب خبر سنائی ہے فرماتے ہیں "دریں دو بست سال کہ قدم آنہا بہ سرزمین ہندوستان رسیدہ بخصوص ہندوستان ہم استعمال ذاتی حسکے پیدا

در ماکولات شاں بسیار استعمال می شود مرچ سوائے آنچہ در پختن داخل نمودہ اند ہنگام خوردن با طعام نیز بافراط می خورند لہٰذا نطفہ ایشاں پشت بر پشت از ماکولات مذکور متکون می شود،

(خزانہ عامرہ میر غلام علی آزاد ص۴۸)

کرتے تاکہ اس کی خشکی کی کچھ اصلاح ہو کیونکہ اگر کوئی روغن ڈالتا بھی ہے تو اس کی مقدار اتنی قلیل ہوتی ہے گویا کہ اس نے روغن کا استعمال نہیں کیا۔ اسی طرح لال مرچ اور ہینگ، ہلدی بھی ان کے کھانوں میں بہت مستعمل ہے۔ لال مرچ کو پکاتے وقت تو کھانے میں شریک کرتے ہی ہیں۔

اس کے سوا جب کھانا کھانے لگتے ہیں۔ اس وقت بھی بکثرت لال مرچ کو چبالیتے ہیں۔ اسی لئے ان کی نسل پشتہا پشت سے اس قسم کی خوراکوں سے تیار ہوتی چلی آرہی ہے۔

خیر یہ تو اس قوم کی چند خصوصیات کا ایک ضمنی ذکر ہے چونکہ اس زمانہ میں اسی کی تعبیر سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی سے کی جاتی ہے اور جو قومیں نسلہا نسل سے نہ اُن خوراکوں کی عادی ہیں نہ اس طرز زندگی کی۔ ان سے جب اسی قسم کے لباس، اسی قسم کے کھانوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ گھبراتی ہیں۔ کچھ دن ساتھ دیتی ہیں اور پھر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اس کے

(بقیہ ص۷۶) مرچ سرخ آموختند پیشتر رواج ایں مرچ در بیت المال ہندوستان نبود (خزانہ عامرہ ص۴۸) واللہ اعلم بالصواب کیا کہا جائے جس طرح چائے ایک حکومت کے زیر اثر ہندوستان کے ہر گھر میں پہنچ گئی ہے یہی حال اس مرچ سرخ کا بھی ہے۔

اسباب کی طرف بھی موقع سے اشارہ کرتا چلوں۔ ورنہ اصل گفتگو تو شاہ صاحب کے خواب کے متعلق ہو رہی تھی یعنی خواب میں جس شان سے یہ دیکھا گیا تھا ٹھیک اُن ہی خصوصیات کے ساتھ ملک الکفار مسلمانان ہند پر مستولی ہو گیا اور ان کے مرکزی مقام پر قبضہ کر لیا تھا۔

شاہ صاحب کے خواب کا دوسرا جزو اور ہندوستان پر غازی احمد شاہ ابدالی کا حملہ اور مرہٹہ طاقت کی شکست

خواب کے دوسرے اجزاء کے متعلق بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ اچانک احمد شاہ ابدالی غازی کا ہندوستان پر جو حملہ ہوا اور مرہٹہ تحریک پانی پت کے میدان میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی کہا جاتا ہے اور یہ نہیں لکھتے ہیں کہ اس حملہ پر احمد شاہ کو خود ہندوستان کے امیروں اور نوابوں نے عرضداشت بھیج کر آمادہ کیا تھا جیسا کہ طباطبائی کا بیان ہے:۔

نجیب الدولہ و راجہائے ہندوستان از دست مرہٹہ و عماد الملک بجاں آمدہ زوال دولت و ملک خود از دست مرہٹہ برائے العین مشاہدہ نمودہ عرائض التجا بخدمت احمد شاہ ابدالی نگاشتہ خواہاں ورود خود در ہندوستان شدند۔

نجیب الدولہ اور ہندوستان کے مختلف راجواڑے مرہٹوں اور عماد الملک کے ہاتھوں جاں بلب ہو کر دیکھنے لگے کہ ان کی حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل کر مرہٹوں کے قبضہ میں جا رہی ہے اپنی آنکھوں سے یہ تماشا ان کو نظر آ رہا تھا تب انہوں نے احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں عرائض لکھ کر بھیجے اور اس

بات کے خواہش مند ہوئے کہ شاہ ابدالی خود ہندوستان پہنچیں۔

مرہٹوں نے جب شجاع الدولہ کو ابدالی کی رفاقت سے روکنے کے لئے اپنے سفراء بھیجے تو اس کے جواب میں بھی شجاع الدولہ نے یہی کہا تھا جس کا ذکر کچھ پہلے بھی آیا ہے یعنی :-

مردانہ دست شاں بکار آمد برائے پاس ناموس و آبروئے خود در رفاہ علماء شاہ ابدالی را بمنت از ولایت طلبیدہ داشتند و صدمات او را بر نیت تنبیہ اعدائے مرہٹہ سہل انگاشتہ

لوگوں کا مرہٹوں کے ہاتھوں ناک میں دم آگیا ہے اپنی عزت وآبرو اور دنیا کی آسائش و امن کے لئے ابدالی کو خوشامد درآمد کر کے ولایت سے بلایا گیا ہے اور ابدالی سے جو نقصانات پہنچیں گے انہیں مرہٹوں کی مصیبت سے آسان خیال کر کے ایسا کیا گیا۔

لیکن یہ تو ابھر والے دیکھ رہے تھے پر بارگاہ الست کے دوربینوں کو انتیس ۲۹ سال پہلے ہی دکھایا گیا تھا کہ یہ

"بالطور فساد" کا "سوط عذاب" تھا جو ہمیشہ فاکثروا فیہا الفساد

جب لوگ زمین پر بگاڑ اور فساد کو (بھلائی اور خیر سے) آگے بڑھا دیتے ہیں۔

کے موقعہ پر قدرتی قانون کے ماتحت ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ لوگوں نے "الغازی الابدالی" کو "خدا کا ہاتھ" خیال کیا۔ لیکن اس عالم محسوس کے پیچھے بھی جو نظام ہے۔ وہاں کسی ام اندہ نے اپنے آپ کو

جعلنی کالجارحۃ	مجھے خدا نے بمنزلہ ایک آلہ اور عضو کے قرار دیا۔

کی شکل میں پایا۔ باہر والوں نے نجیب الدولہ، شجاع الدولہ، دوندے خاں، رحمت خاں اور آخر میں ان سب کے ساتھ "ابدالی کے قلوب کو غصہ سے معمور پایا۔ لیکن اندر والے نے اس کو باہر سے نہیں بلکہ اس غضب کی آگ کو" اندر" سے بلکہ" باطن الباطن" سے بھڑکتے ہوئے ملاء اعلیٰ تک اور ملاء اعلیٰ سے خود اپنے اندر پہنچتی ہوئی محسوس کیا۔ جیسا کہ فرماتے ہیں :۔

تغضب اللّٰہ علی اھل الارض غضبا تاً شــدیدا ورائت صورۃ ھذا الغضب متمثلۃ فی الملاء الا علی ثم ترشح الغضب الی فرمتنی غضبا ناً۔	پھر اللہ تعالیٰ زمین والوں پر سخت غصہ کے ساتھ غضبناک ہوا۔ اور میں نے اسی غصہ کو ملاء اعلیٰ میں متمثل ہوتے ہوئے پایا۔ وہاں سے ٹپک ٹپک کر وہی غصہ مجھ میں اترا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو بھی غضب ناک پایا۔

اور یہی آگ تھی جو غیب سے چل کر بالآخر پانی پت کے میدان میں بھڑکی اور جن پر خدا کا غضب تھا وہ اس میں بھسم ہوئے۔ باہر والوں نے "پانی پت کی آخری جنگ" کا مرد میدان احمد شاہ ابدالی رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا۔ لیکن آج سننے والے سن رہے ہیں کہ اس سلسلہ میں اپنے کو" قائم الزماں" کسی اور کو دکھایا گیا تھا۔

شاہ صاحب نے اس خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ خود اس معرکہ میں مسلمانوں نے بھی مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ اور ان مسلمانوں کے متعلق ان سے پوچھا بھی گیا جس کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کون نہیں جانتا کہ مرہٹوں کی اس جنگ میں مسلمانوں کی بھی ایک جماعت بطور نوکروں کے مرہٹوں کے ساتھ تھی ان میں حضرمی عرب بھی تھے اور ہندوستان کے مسلمان بھی خصوصاً توپ خانہ کا سردار تو آج تک ابراہیم گاردی کے نام سے مشہور ہے جو "با دوازدہ ہزار بندوق چقماقی و توپہا بقاعدۂ فرنگ" مرہٹوں کے ساتھ تھا اور اسی نے ایک مدت تک توپوں کی زنجیر بندی کر کے مرہٹوں کو سانس لینے کا موقع دیا اور تعجب ہی کیا۔ اور کیوں ہو۔ کیا آج بھی مختلف رنگوں میں یہی تاریخ نہیں دہرائی جا رہی؟

شاہ صاحب نے یہ بھی دیکھا تھا کہ پوچھنے والوں نے پوچھا کہ "خدا کا حکم اس وقت کیا ہے؟ تو آپ نے فک[1] کل نظام (اس وقت ہر قسم کے نظم کو ختم کر دینا چاہئے) فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس وقت پانی پت کی جنگ ہوئی۔ ہندوستان کے تقریباً بڑے بڑے نواب اور امیر اپنی اپنی حکومتوں کو چھوڑ کر آخری فیصلے کے لئے میدان میں اتر آئے تھے۔ حتیٰ کہ دلی میں بھی کوئی نظام

[1] ہمارے ایک اشتراکی مزاج دوست نے جو اسلامی نظام کو بھی ایک قسم کا اشتراکی نظام یا اقرب الی الاشتراکیت سمجھتے ہیں۔ نہ معلوم کہاں سے نقل فرمایا ہے کہ شاہ صاحب سے عالم رؤیا یا مکاشفہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا یعنی انقلاب کا حکم دیا غالباً اس کو ارشاد نبوی ٹھہرانے میں ان سے سہو ہوا ہے۔ ۱۲ منہ

حکومت باقی نہ تھا اور جب تک "غضب الہیٰ" کا ظہور رہا اس وقت تک کوئی نظام قائم نہ ہو سکا۔ شاہ صاحب نے یہ بھی دیکھا کہ ملک الکفار پکڑا گیا اور ذبح ہوا طبا طبائی واقعات کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب کشتوں کے پشتے لگ گئے

تو سرداران اوّل بسواس راؤ پسر بالاجی راؤ کہ شہزادۂ آنہا بود، در عین شباب بزخم تفنگ آہنگ صحرائے عدم نمود

تو اعلیٰ درجہ کے مرہٹہ سردار بالاجی پیشوا کا بیٹا بسواس راؤ جو مرہٹوں کا شہزادہ تھا عین جوانی کے دنوں میں بندوق کے فیر سے عدم کے صحرا کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہاشمی صاحب اپنی تاریخ ہند میں ناقل ہیں کہ بھاؤ نے دلی پہنچ کر چاہا تھا کہ اپنے بھتیجے (یعنی اسی بسواس راؤ پسر بالاجی) کو تخت پر بٹھا کر یہ اعلان کر دے کہ "اب ممالک ہند کی شہنشاہی مرہٹہ برہمنوں کی ملکیت ہے"۔ لیکن پھر جنگ کے فیصلہ تک اعلان کے خیال کو ملتوی کر دیا۔

بہرحال تخت شاہی پر بٹھائے جانے والے بسواس راؤ بھی اور بٹھانے والا بھاؤ بھی اسی جنگ میں ختم ہوئے۔ طبا طبائی ان دونوں کے ذکر کے بعد ایک طویل فہرست درج کرتے ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں:۔

واز سرداران نامور غنیم احدے جاں بسلامت نہ برد مگر دو سہ کس

دشمن کے نامور سرداروں میں کوئی اپنی جان بچا کر نہ بھاگ سکا مگر صرف دو تین آدمی

خواب میں "ملوکانہ اقتدار" کے ان مظاہر کو بلکہ "شہزادہ آنہا" جس کی بادشاہت کا گویا صرف اعلان کرنا باقی رہ گیا تھا۔ اگر اسی خواب میں

رائت الدم ینفجر من	میں نے دیکھا کہ اس کی شہ رگ سے
اوداجہ متوالیا	خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

کی شکل میں دیکھا گیا۔ تو مثالی اور ناسوتی تعلقات کے جاننے والے کیا تعبیر کی تکمیل میں شک کر سکتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جب تمام مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ :-

بعد از وقوع ایں شکست	اس فاش شکست کے بعد بالاجی
فاحسس بالاجی ہم غصہ مرگ گشتہ	(یعنی پیشوا جو مرہٹوں کا حال بادشاہ تھا)
پس از پنج ماہ و سیزدہ روز نوزدہم	وہ بھی موت کے غصہ کا شکار ہو گیا۔
ذیقعدہ سال مذکور بہ پسر و برادر خود	پانچ مہینے تیرہ روز بعد انیسویں ذیقعدہ کو
ملحق گشت	اسی سال وہ بھی اپنے لڑکے اور بھائی
	(بھاؤ) کے ساتھ جا کر مل گیا۔

تو پھر بغیر "تاویل" کے شاہ صاحب کا خواب "کفلق الصبح" بن جاتا ہے۔ بلکہ خواب میں ملک الکفار کا میدان جنگ میں نہ قتل ہونا اور بعد کو ملک الاسلام کے ساتھ ساتھ چلنا اس کے یہی معنی ہیں کہ ہر طرف سے گھر جانے گویا قیدیوں کے مانند ہونے کے بعد پھر بھی کچھ دن وہ "ملک الاسلام" کے ساتھ رسوائی و ذلت کی زندگی گزارے گا اور بالآخر ختم ہو جائے گا۔ یہاں ایک نقطہ قابل لحاظ یہ بھی ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے یہ خواب ذیقعدہ ہی میں دیکھا تھا اور بالاجی راؤ کا انتقال بھی ذیقعدہ ہی میں ہوا۔

درمیان میں ایک خاص چیز جس کی طرف شاہ صاحب نے اجمالاً لیکن

لیغ فقرہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ اپنے غیظ و غضب کے متعلق آپ کا یہ جملہ ہے۔ کہ

نفث من تلك الحضرة فی نفسی لا من جهة ما یرجع الی هذا العالم۔	حضرت (الٰہ) کی طرف سے یہ نفثہ مجھ میں پھونک دیا گیا۔ اور اس کا سبب انتشار کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کا تعلق اس عالم سے ہو۔

یہ بڑے پتہ کی بات ہے کہ ایک حمیت و غیظ و غضب تو وہ ہوتا ہے جس کی محرک (مثلاً) اپنی کوئی رسوائی و فضیحت ہوتی ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس میں مومن و کافر سب ہی شریک ہو سکتے ہیں۔ اور ہوتے ہیں لیکن اس حمیت اور غصہ کا خدا کے یہاں بھی اجر ہے یا اس کا شمار حمیت الجاہلیۃ میں ہے بہت زیادہ محل غور و تامل ہو سکتا ہے۔ اسی کی تعبیر حضرت نے کم از کم میرے نزدیک ما یرجع الی هذا العالم سے فرمائی ہے۔ لیکن ایک حمیت و غیظ وہ ہے جس کی بنیاد "الحب للّٰہ والبغض للّٰہ" کی نہ ہلنے والی چٹان پر قائم ہے۔ یہی حمیت و غیرت اور یہی غیظ و غضب وہ ہے جس کی پیدا کردہ دعا و ہمت اور الحاح و زاری سے غیب اور غیب الغیب تک کے دوائر میں جنبش پیدا ہو جاتی ہے سچ پوچھئے تو حمیت کی یہی الٰہی رگ جب کسی کی پھڑک اٹھتی ہے اور اسی قدسی محرک سے جب کسی کے خون میں جوش آتا ہے تو ایک "بیوہ زن" کی آہ بھی "برکند عالمے" کا تماشہ دکھاتی ہے۔ اور دستگیر نالوں کا یہی شور ہوتا ہے۔ جو "المنتقم الجبار" کی انتقامی شانوں کو برسر کار لا کر ملا اعلیٰ و اسفل میں تلاطم پیدا

کرکے کتنے ابدالی اور کتنے حافظ الملک، دوندے خاں اور نجیب الدولہ کی شکل عالم ناسوت میں اختیار کرتا ہے۔ حالانکہ کام کسی کنج نشین کا دل شکستہ کرتا ہے لیکن تاریخ والے ان واقعات کو ان ہی ناسوتی مظاہر اور شہادتی قوالب کی طرف منسوب کرتے ہیں، نالوں کی بے تاثیری کے شکوہ کرنے والے چاہیں تو حضرت شاہ صاحب کے اس عمیق لیکن مختصر اشارہ ہی سے اپنی ہدایت کی شمع روشن کر سکتے ہیں۔ اور جو مشکلات کی گرہوں کو دماغ کے زور سے کھولنے میں جب بے بس ہو جائیں تو دل کی قوت سے بھی وہ امداد حاصل کر سکتے ہیں۔
بہرحال اس کے بعد شاہ صاحب نے دیکھا ایک کے بعد دیگرے شہروں کو فتح و برباد کرتے ہوئے ہم "اجمیر" پہنچ گئے۔ تاریخوں کو اٹھا کر پڑھیئے۔ ٹھیک اسی شان کے ساتھ ابدالی اور ان کے رفقاء شہروں کو فتح کرتے ہوئے "اسلامی مرکز" یعنی دہلی پہنچ گئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ملک الکفار کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں پر رحمت و سکینت نازل ہوئی اور ان پر خدا کا رحم ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس "فتح" کے بعد وہی لوگ جن کا مال چھینا گیا۔ اور جن کی شاہی حرم سرائیں کفار کے قبضہ میں آگئی تھیں۔ نہ کہ غنیم کی فوج سے

دو ہزار غلام و کنیز کہ اکثرے از اولاد	دو ہزار غلام اور لونڈیاں جن میں اکثر
و اعیان و سرداران و متوسطان بود کہ در	بڑے اور اوسط درجہ کے لوگوں کے
عسکریان ابدالی تقسیم یافت و غنائمے	خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ابدالی کے
کہ در احاطہ و انحصار نمی گنجد از جواہر	لشکر میں تقسیم ہوئیں اور جواہر نقدیہ
نقود و اجناس دیگر و توپ خانہ،	اور دوسری قسم کی چیزیں توپخانے

پنجاہ ہزار اسب و دو لکھ گاؤ و چندیں ہزار شتر و پانصد فیل کوہ پیکر بدست عساکر منصورہ افتاد۔ ص ۹۱۴

وغیرہ کے ذیل کے بیشمار مال غنیمت میں ہاتھ آئیں۔ پچاس ہزار گھوڑے دو لاکھ بیل اور کئی ہزار اونٹ، پانچ سو ہاتھی کوہ پیکر کامیاب اور فتحمند فوج کے قبضہ میں آئے۔

شاہ ابدالی کا بے نظیر ایثار اور اس کا راز

اس تاریخی معرکہ کا حال بھی شاہ صاحب کی اس رویائے صادقہ میں اگر لوگ چاہیں تو تلاش کرسکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کرنے دھرنے کے بعد شاہ غازی ابدالی انار اللہ برہانہ نے

شانزدہم شعبان سال مذکور از باغ شالامار دہلی بقصد قندھار یکراں ہمت زیر راں کشید و کلمہ مراجعت قندھار نمود۔

اسی سال کی سولھویں شعبان کو دلی کے شالامار باغ سے ہمت کے گھوڑے پر سوار ہو کر قندھار کا ارادہ فرمالیا۔ اور اسی طرف پلٹ گئے۔

اور بخوشی و رضا شاہ ابدالی نے

سلطنت برائے شاہ عالم و وزارت بنام شجاع الدولہ و امیر الامرائی بنام نجیب الدولہ مقرر نمود۔

سلطنت کو شاہ عالم کے نام، وزارت شجاع الدولہ کے نام اور امیر الامرا نجیب الدولہ کے نام مقرر فرماکر خود قندھار چل دیئے۔

لوگ حیران ہیں کہ اتنے بڑے سانحہ پر اتنی عظیم کامیابی و فتحمندی کے بعد

ابدالی کا ملک کو شاہ عالم ہی کے سپرد کر کے قندھار جیسی معمولی حکومت کی طرف واپس ہو جانے کا کیا راز تھا؟ حضرت شاہ صاحب کا وہی فقرہ کہ یہ جو کچھ تھا کسی اور عالم کی بات تھی۔

لا مایرجع الی ھذا العالم اس کا تعلق اس دنیا کے قانون سے نہ تھا۔

اگر یہ صحیح ہے۔ اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے تو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ غازی ابدالی قدس سرہٗ نے اپنے دین کو دنیا اور اپنے خدا کو بت بنانا نہیں چاہا جن کے اندر ان الدار الاخرۃ لھی الحیوان، والاخرۃ خیر و ابقیٰ کا یقین راسخ نہیں ہوا ہے اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ان کو اعتماد کامل میسر نہیں ہوا ہے ورنہ اس کی توثیق و تکمیل کے بعد یقیناً ان کو بھی وہی نظر آ سکتا ہے جو ابدالی موثر الآخرۃ علی الدنیا کو نظر آیا تھا۔ لیکن" رضوا بالحیوٰۃ الدنیا واطمانوا بھا" جن کا انتہائی مبلغ علم ہو۔ ان کے فہم سے سچ ہے کہ یہ بات بعید ہی نہیں بلکہ ناممکنات کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ محمدی معجزوں میں اگر کوئی چاہے تو اس "ایثار ابدالی" کو بھی شریک کر سکتا ہے۔

نقمت اور نعمت کے بعد بھی مسلمانوں کی غفلت اور خدا فراموشی

یہ واقعہ بھی گزر گیا۔ اس فتنہ کا انتہا بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی زندگی میں ہوا اور اس دنیا سے روانہ ہونے سے پہلے اپنے خواب کی تعبیر بھی انہوں نے دیکھ لی لیکن جن

مسلمانوں کے "مکاسب ایدی" اور "زشتئ اعمال" نے مرہٹوں کی شکل اختیار کی تھی۔ باوجود سب کچھ دیکھنے کے کیا اُن میں کوئی تغیر پیدا ہوا تھا حضرت شاہ صاحب کا مکاشفہ کہ مسلمانوں اور اسلام پر "ملک الکفار" کی جانب سے جو مظالم ہو رہے تھے اسی سے

غضب اللہ تعالیٰ علی اھل الارض غضباً شدیداً۔ — زمین والوں پر حق تعالیٰ سخت غصہ کے ساتھ غضب ناک ہوئے

کا ظہور ہوا تھا۔ واحسرتاہ یا ویلاہ کہ "غیب" میں جس امت کی بے نازبرداریاں ہیں آہ کہ اس کی بے نیازیوں میں سچ پوچھئے تو کوئی کمی نہیں یا بہت کم کمی واقع ہوئی تھی اور اپنی زشتی اعمال کو بصورت نادر "بھی قرار دیتے تھے وہ سکھی اور مرہٹی فتنوں کو خدا کی تنبیہ بھی سمجھتے تھے لیکن باوجود سب کچھ سمجھنے کے کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ سب کچھ دیکھنے کے انہیں کچھ نہیں سوجھتا تھا فطرتیں مسخ ہو چکی تھیں، دلوں پر میل اور زنگ چھایا ہوا تھا، دیکھتے تھے سنتے تھے اور نہیں سنتے تھے۔ سننے والے بہرے اور دیکھنے والے اندھے ان میں زیادہ پیدا ہو چکے تھے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی چیخ پکار اور خطرہ کا مسلسل الارم

وہ "قدسی روح" جو اس بجھتے ہوئے چراغ کو آخری دفعہ سنبھالا دینے کے لئے "غیب" سے ہندوستان کے مسلمانوں کو دی گئی تھی وہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی لیکن ان میں کم تھے جو اس نقار خانہ میں طوطی کی اس آواز پر کان رکھتے۔ میری مراد حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ

سے ہے۔ ان کی مختلف کتابوں میں ان کی چیخ و پکار کی شورشیں اس وقت تک بند ہیں۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا "پیغام" کیا تھا مختلف طریقوں سے وہ مسلمانوں پر پیش کیا جاتا تھا لیکن ان میں علم بافوں کتاب بازوں اور معارف فروشوں کا ایک گروہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا غلطی ہوئی اور بڑی غلطی ہوئی کہ شاہ ولی اللہ کو بھی ان ہی پیشہ وروں میں سے ایک خیال کیا گیا حالانکہ وہ ہر بات میں ان سے جدا تھا۔ اس کی آواز سب سے نرالی تھی لیکن اس کی تمیز کس میں باقی تھی۔

مسلمانوں کے مختلف طبقات کے نام شاہ صاحب کا ایک پیغام اور سب کیلئے مفصل پروگرام

بطور نمونہ کے حضرت شاہ صاحب کے ایک پیغام کا ترجمہ درج کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ "لیلاً ونہاراً او سراً وجہراً" جس امر کی دعوت دے رہے تھے وہ کیا تھا "تفہیمات الہیہ" کے جامع نے ایک جگہ اس کو بھی درج کر دیا ہے میں اسی کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ اصل عبارت کے نقل کرنے میں طوالت ہوگی۔ عربی کے جاننے والے عربی میں پڑھ سکتے ہیں۔ خدا جزائے خیر دے مجلس علمی ڈابھیل کو جس نے ان چند سالوں میں ان گراں بہا دفینوں کو وقف عام کر دیا ہے۔ بہر حال منجملہ تفہیمات کے ایک طویل تفہیمی مقالے کے بعض اجزاء یہ ہیں۔ جس میں مسلمانوں کے مختلف طبقات اور گروہوں کو ان کے موجودہ حالات پر تنبیہ کر کے آپ نے اصلاح کی راہ سجھائی ہے مثلاً سلاطین اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

سلاطین اسلام سے خطاب

"اے بادشاہو! ملاءِ اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تمام تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو۔

جب تک مسلم مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے اور اہل کفر و فسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جا کر شامل نہ ہو جائیں اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں۔ قاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ (یعنی ان سے جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ فرو ہو جائے اور "دین" صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے) پھر جب کفر و اسلام کے درمیان ایسا کھلا نمایاں امتیاز پیدا ہو جائے تب تمہیں چاہئے کہ ہر تین دن یا چار دن کے سفر کی منزلوں پر اپنا ایک ایک حاکم مقرر کرو۔ ایسا حاکم جو عدل و انصاف کا مجسمہ ہو۔ قوی ہو، جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکتا ہو، اور حدود کے حدود کو قائم کر سکتا ہو اور اس میں سرگرم ہو کہ پھر لوگوں میں بغاوت و سرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں وہ جنگ پر آمادہ نہ ہوں اور دین سے مرتد ہونے کی کسی میں جرأت باقی نہ رہے، نہ کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی کسی کو مجال ہو، اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو۔ اور اس کے شعائر کا علانیہ اظہار کیا جائے۔ ہر شخص اپنے متعلقہ فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے۔ چاہئے کہ ہر شہر کا حاکم اپنے پاس اتنی قوت رکھے جس کے ذریعے سے اپنے متعلقہ آبادی کی

اصلاح کر سکتا ہو۔ مگر اسی کے ساتھ اس کو اتنی قوت فراہم کرنے کا موقع نہ دیا جائے جس کے بل بوتے پر وہ خود ان سے نفع گیر ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے اور حکومت کے مقابلہ پر آمادہ ہو جائے۔

چاہئے کہ اپنے متعلقہ مقبوضات کے بڑے علاقہ اور اقلیم پر ایسے امیر مقرر کئے جائیں جو جنگی مہمات کا بھی اختیار رکھتے ہوں ایسے امیر کے ساتھ بارہ ہزار کی جمعیت رکھی جائے مگر جمعیت ایسے آدمیوں سے بھرتی ہو جن کے دل میں جہاد کا ولولہ ہو اور خدا کی راہ میں کسی کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوں۔ ہر سرکش و متمرد سے جنگ اور مقابلہ کی ان میں صلاحیت ہو ———— اے بادشاہو! جب تم یہ کر لوگے تو اس کے بعد ملاء اعلیٰ کی رضامندی یہ چاہے گی کہ تم لوگوں کی منزلی اور عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو۔ ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ اور ایسا کردو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے جو شرعی قوانین کے مطابق نہ ہو اسی کے بعد لوگ امن و امان کی صحیح مسرت سے فائز المرام ہو سکتے ہیں۔"

اسلامی امیروں کو مخاطب فرماتے ہوئے فرماتے ہیں :-

امراء و ارکانِ دولت سے خطاب

"اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو۔ اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے

اور نگلتے رہیں ——— کیا تم علانیہ شرابیں نہیں پیتے؟ اور پھر اپنے اس فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے! تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کئے ہیں کہ ان میں زنا کاری کی جائے اور شرابیں ڈھالی جائیں، جوا کھیلا جائے لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے۔ اور اس حال کو نہیں بدلتے۔ کیا حال ہے ان بڑے بڑے شہروں کا جن میں چھ سو سال سے کسی پر حد شرعی نہیں جاری ہوئی۔ جب کوئی کمزور مل جاتا ہے۔ تو اسے پکڑ لیتے ہو اور جب قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو، تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو۔ اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی، کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے؟ خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہانیوں میں اس نام کو استعمال کرو اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانہ کا انقلاب ہے۔ کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے یعنی زمانے کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے۔"

فوجی سپاہیوں کو خطاب

اے فوجیو اور سپاہیو! تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا

فرمایا تھا مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہو گی اور خدا کا کلمہ بلند ہو گا اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دنیا سے نکال پھینکو گے لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے اسے تم چھوڑ بیٹھے۔ اب جو تم گھوڑے پالتے ہو، ہتھیار جمع کرتے ہو اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ محض اپنی دولت میں اس سے اضافہ کرو۔ اس سلسلہ میں جہاد کی نیت سے تم بالکل خالی الذہن رہتے ہو ــــ تم شرابیں پیتے ہو، بھنگ کے پیالے چڑھاتے ہو، ڈاڑھیاں منڈواتے ہو۔ اور مونچھیں بڑھاتے ہو۔ عام لوگوں پر زیادتیاں اور ظلم کرتے ہو حالانکہ جو کچھ ان کا لے کر کھاتے ہو اس کی قیمت ان تک نہیں پہنچتی ــــ خدا کی قسم، تم عنقریب اللہ کی طرف واپس جاؤ گے پھر تمہیں وہ بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے ــــ تمہارے ساتھ خدا کی یہ مرضی ہے کہ اچھے پارسا، صالحین، غازیوں کا لباس اور ان کی وضع اختیار کرو۔ چاہئے کہ اپنی ڈاڑھیاں بڑھاؤ، مونچھیں کٹواؤ، پنج وقتہ نماز ادا کیا کرو۔ اور عام لوگوں کے مال سے بچتے رہو۔ جنگ اور مقابلہ کے میدان میں ڈٹے رہو۔ تمہیں چاہئے کہ سفر اور جنگ وغیرہ کے موقع پر نمازمیں جو آسانیاں اور رخصتیں رکھی گئی ہیں انہیں سیکھ لو مثلاً قصر کرنا، جمع کرنا، سنتوں کے ترک کرنے کی اجازت ہے اس سے واقف ہونا، تیمم کی اجازت سے مطلع ہونا ــــ پھر اس کے بعد نماز کو خوب زور سے پکڑ لو۔

اور اپنی نیتوں کو درست کر لو۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے جاہ و منصب میں برکت دے گا اور دشمنوں پر تمہیں فتح عطا فرمائے گا۔"

عام پیشہ وروں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

اہل صنعت وحرفت سے خطاب

ارباب پیشہ! دیکھو، امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے تم اپنے رب کی عبادت سے خالی الذہن ہو چکے ہو اور تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو تم مدار اور سالار کا حج کرتے ہو۔ تم میں بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹونا ٹوٹکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے۔ یہ لوگ خاص قسم کا لباس اور بانا اختیار کرتے ہیں۔ خاص طرح کے کھانے کھاتے ہیں حالانکہ میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے وہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے۔ تم میں بعض صرف شراب خوری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور تم ہی میں کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ پالتے ہیں۔ یہ کیا بد بخت آدمی ہے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے مختلف قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں

اختیار کرو۔ اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ جو تمہیں بآسانی اُخروی زندگی کے نتائج تک پہنچا دے ۔۔۔ لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی اور غلط راہ حصول رزق کی اختیار کی کیا تم جہنم کے عذاب سے نہیں ڈرتے جو بڑا بُرا بچھونا ہے دیکھو! اپنی صبح و شام کو خدا کی یاد میں بسر کیا کرو۔ اور دن کے بڑے حصّہ کو اپنے پیشہ میں صرف کرو اور رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ گزارو۔ اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی مسکینوں کی مدد کیا کرو اور کچھ اپنے اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لئے پسماندہ بھی کیا کرو۔

تم نے اگر اس راہ کو اختیار نہ کیا تو تم غلط راہ پر جا رہے ہو اور تمہاری تدبیر درست نہیں ہے۔

پھر اسی طرح مشائخ کی اولاد اپنے زمانہ کے عام طلبۂ علم اور واعظوں زاہدوں کو بھی آپ نے خصوصیت کے ساتھ پکارا ہے مثلاً مشائخ کی اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب

اے وہ لوگو! جو اپنے آباء کے رسم کو بغیر کسی حق کے پکڑے ہوئے ہو یعنی گزشتہ بزرگان دین کی اولاد میں ہو میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹکڑیوں ٹکڑیوں ٹولیوں ٹولیوں میں آپ بٹ گئے ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے راگ

اپنی اپنی منزل میں الاپ رہا ہے۔ اور جس طریقہ کو اللہ نے اپنے رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے نازل فرمایا تھا۔ اور محض اپنے لطف و کرم سے جس راہ کی طرف راہنمائی فرمائی تھی۔ اسے چھوڑ کر ہر ایک تم میں ایک مستقل پیشوا بنا ہوا ہے۔ اور لوگوں کو اسی طرف بلا رہا ہے اپنی جگہ اپنے کو راہ یافتہ اور راہنما ٹھیرائے ہوئے ہے۔ حالانکہ دراصل وہ خود گم کردہ راہ اور دوسروں کو بھٹکانے والا ہے۔ ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تاکہ ان سے ٹکے وصول کریں۔ ایک علم شریعت کو سیکھ کر دنیا بٹورتے ہیں۔ کیونکہ جب تک اہل دین کی شکل و شباہت اور طرز و انداز نہ اختیار کریں کے دنیا حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور نہ میں ان لوگوں سے راضی ہوں جو سوائے اللہ و رسول خود اپنی طرف بلاتے ہیں۔ اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ یہ لوگ بٹ مار اور راہگیر ہیں۔ ان کا شمار دجالوں، کذابوں، فتانوں اور ان لوگوں میں ہے جو خود فتنہ اور آزمائش کے شکار ہیں۔

خبردار! خبردار! ہرگز اس کی پیروی نہ کرنا۔ جو اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو۔ اور اپنی طرف بلاتا ہو۔ اور چاہیئے کہ زبانی جمع خرچ صوفیہ کرام کے اشاروں کے متعلق

عام مجلسوں میں نہ کیا جائے۔ کیونکہ مقصود تو (تصوف) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا مقام حاصل ہو جائے۔ لوگو، دیکھو کیا تمہارے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ارشاد میں کوئی عبرت نہیں ہے۔

ان ھذا صراطی مستقیما	یہ میری راہ ہے سیدھی، تو اس
فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل	پر چل پڑو اور مختلف راہوں کے
فتفرق بکم عن سبیلہ	پیچھے نہ پڑو، وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بچھڑا دیں گے

پھر اس زمانہ کے طلبہ علم کو خطاب کر کے فرماتے ہیں :-

غلط کار علماء سے خطاب

اے بدعقلو! جنہوں نے اپنا نام "علماء" رکھ چھوڑا ہے۔ تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو۔ اور صرف ونحو معانی میں غرق ہو اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے۔ یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔

چاہیے کہ قرآن سیکھو! پہلے اس کے غریب لغات کو حل کرو سبب نزول کا پتہ چلاؤ اور اس کے مشکلات کو حل کرو۔ اسی طرح جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح ثابت ہو چکی ہے۔ اسے محفوظ کرو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کس طرح پڑھتے تھے، وضو کرنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا طریقہ تھا۔ اپنی ضرورت کے لئے کس طرح جاتے تھے۔ اور حج کیونکر ادا فرماتے تھے۔ جہاد کا

آپ کے کیا قاعدہ تھا۔ گفتگو کا کیا انداز تھا۔ اپنی زبان کی حفاظت کس طرح فرماتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے۔ چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری روش کی پیروی کرو۔ اور آپ کی سنت پر عمل کرو۔ مگر اس میں بھی اس کا خیال رہے کہ جو سنت ہے اُسے سنت ہی سمجھو نہ کہ اسے فرض کا درجہ عطا کرو۔ اسی طرح چاہئے کہ جو تم پر فرائض ہیں انہیں سیکھو مثلاً وضو کے ارکان کیا ہیں، نماز کے ارکان کیا ہیں۔ زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے قدر واجب کیا ہے۔ میت کے حصوں کی مقدار کیا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام سیرت کا مطالعہ کرو جس سے آخرت کی رغبت پیدا ہو۔ صحابہ اور تابعین کے حالات پڑھو اور یہ چیزیں فرائض سے فاضل اور زیادہ ہیں لیکن ان دنوں جن چیزوں میں تم اُلجھے ہوئے ہو۔ اور جس میں سر کھپا رہے ہو۔ اس کو آخرت کے علم سے کیا واسطہ، یہ دنیا کے علوم ہیں۔

پھر ان ہی طلبہ کو فرماتے ہیں :۔

جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع و آلات کی ہے (مثلاً صرف و نحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو۔ نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم کا پڑھنا تو اسی لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو

زائد ساز ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے۔ حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں۔ جو علماء سے خالی ہیں۔ اور جہاں علماء پائے بھی جاتے ہیں وہاں بھی دینی شعاروں کو غلبہ حاصل نہیں ہے۔

پھر آپ نے ان لوگوں کو بھی مخاطب کیا ہے جنہوں نے اپنے وسوسوں کا نام دین رکھ چھوڑا ہے اور جو ان کے وسواسی معیار پر پورا نہیں اترتا گویا دین سے وہ خارج ہے۔ اس گروہ میں زیادہ تر زہاد، عباد اور وعاظ ہی اس زمانہ میں مبتلا تھے۔ اس لئے عنوان کا آغاز ان ہی سے کیا گیا ہے فرماتے ہیں :-

دین میں تنگی پیدا کرنیوالے واعظوں اور کنج نشین زاہدوں سے خطاب

دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنیوالوں سے میں پوچھتا ہوں۔ اور واعظوں، عابدوں اور ان کنج نشینوں سے سوال ہے جو خانقاہوں میں بیٹھتے ہیں —— کہ بہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا کیا حال ہے۔ ہر بُری بھلی بات، ہر رطب و یابس تمہارا ایمان ہے۔ لوگوں کو تم جعلی اور گھڑی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو۔ اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے۔ حالانکہ تم تو (اے امتِ محمدیہ) اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں

ہم پہنچاؤ گے نہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کرو گے تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہو جو بیچارے مغلوب الحال تھے اور عشق و محبت الٰہی میں عقل و حواس بھی کھو بیٹھے تھے۔ حالانکہ اہل عشق کی باتیں وہیں کی وہیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں نہ کہ ان کا پرچا کیا جاتا ہے ــــــ تم نے وسواس کو اپنے لئے گوارا کر لیا ہے اور اس کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے ــــــ حالانکہ تمہیں صرف یہ چاہیئے تھا کہ اعتقاداً و عملاً احسان کے مقام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے۔ بس اس کو سیکھ لیتے۔ لیکن جو بیچارے اپنے خاص حال میں مغلوب تھے۔ خواہ مخواہ ان کی باتوں کو احساس خالص امور میں گڈمڈ کرنے کی حاجت نہ تھی اور نہ اربابِ کشف کی چیزوں کو ان میں مخلوط کرنے کی ضرورت تھی۔

چاہیئے کہ مقامِ احسان کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ پہلے اسے خود سیکھ لو پھر دوسروں کو دعوت دو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سب سے بڑی رحمت اور سب سے بڑا کرم اللہ کا وہ ہے۔ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا ہے۔ وہی صرف ہدایت ہے جو آپ کی ہدایت ہے۔ پھر تم کیا بتا سکتے ہو کہ جن افعال کو تم کرتے ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کیا کرتے تھے۔

آخر میں ایک عام مسلمانوں کے نام ہے جس میں کسی خاص طبقہ کی

تخصیص نہیں ہے۔ فرماتے ہیں :-

عام امت مسلمہ سے جامع خطاب اس کے امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز

میں مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف اب مخاطب ہوں

اور کہتا ہوں۔ آدم کے بچو! دیکھو!! تمہارے اخلاق مسخ ہو چکے ہیں۔ تم پر بیجا حرص و آز کا بھوکا سوار ہو گیا ہے۔ تم پر شیطان نے قابو پا لیا ہے۔ عورتیں مردوں کے سر چڑھ گئی ہیں اور مرد عورتوں کے حق برباد کر رہے ہیں۔ حرام کو تم نے اپنے لئے خوشگوار بنا لیا ہے۔ اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے۔ پھر قسم ہے اللہ کی، اللہ نے ہرگز کسی کو اس کے بس سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے چاہئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو۔ خواہ تمہیں ایک سے زیادہ نکاح ہی کیوں نہ کرنا پڑیں اور اپنے مصارف، وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو اسی قدر خرچ کرو جس کی تم میں سکت ہو۔ یاد رکھو۔ ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔ اور اپنے اوپر خواہ مخواہ تنگی سے کام نہ لو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کی حدود تک پہنچ جائیں گے اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے۔ کہ اس کے بندے اس کی آسانیوں سے نفع اٹھائیں۔ جیسا کہ یہ بھی اسی کو پسند ہے کہ جو چاہیں۔ اعلیٰ مدارج پر احکام کی پابندی بھی کر سکتے ہیں۔ اپنے

شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہیے کہ کھانوں سے کرو اور اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں۔ دوسروں کے سینے کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو۔ کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو۔ تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں، اسی طرح بے چارے بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ۔ تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمہیں معاش کی بھی راہ سجھائے گا جو تمہارے لئے کافی ہوگی۔

اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو۔ جس میں وہ آرام کرے۔ اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو۔ اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے۔ اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے۔ ایسی بیوی جو اس کی شرمگاہ کی حفاظت کر سکتی ہو۔ اور اس کے رہن سہن کی جد و جہد میں مدد دے سکتی ہو۔ تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے۔ چاہیئے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔

بہرحال کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے اور اسی کے ساتھ قناعت کو اپنا دستور زندگی بنائے ــــ اور رہنے سہنے میں اعتدال کا جادہ اختیار کرے۔ اور اللہ کی یاد کے لئے جو فرصت ہم دست ہو اسے غنیمت شمار کرے۔ کم از کم تین

وقتوں صبح، شام اور پچھلی رات کے ذکر کا خاص طور سے خیال رکھے۔ حق تعالیٰ کی یاد، اس کی تسبیح و تہلیل اور قرآن کی تلاوت کے ذریعہ سے کیا کرے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنے اور ذکر کے حلقوں میں حاضر ہوا کرے۔

اے آدم کے بچو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کرلئے ہیں۔ جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے — تم تم عاشورہ کے دن جھوٹی باتوں پر اکٹھا ہوتے ہو۔ اسی طرح شب برات میں کھیل کود کرتے ہو۔ اور مُردوں کے لئے کھانے پکا پکا کر کھلانے کو اچھا خیال کرتے ہو۔ اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو۔

اسی طرح اور بھی بری بری رسمیں تم میں جاری ہیں جس نے تم پر تمہاری زندگی تنگ کر دی ہے۔ مثلاً تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے۔ اسی طرح ایک بری رسم یہ بھی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن طلاق کو گویا تم نے ناجائز ٹھہرا لیا ہے۔ یوں ہی بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکے رہتے ہو۔ ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو، وقت برباد کرتے ہو۔ اور جو صحت بخش روش تھی اسے چھوڑ بیٹھے ہو۔

تم نے اپنی نمازیں برباد کر رکھی ہیں۔ تم میں کچھ لوگ ہیں جو دنیا کمانے میں اور اپنے دھندوں میں اتنے پھنس گئے ہیں کہ

نماز کا انہیں وقت ہی نہیں ملتا۔ کچھ لوگ ہیں جو قصہ کہانی سننے میں وقت گنواتے ہیں۔ خیر پھر بھی اگر ایسی مجلسیں لوگ ایسے مقامات پر قائم کیا کرتے جو مسجدوں سے قریب ہو۔ تو شاید ان کی نمازیں ضائع نہ ہوتیں۔ تم نے زکوٰۃ کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ کوئی ایسا دولت مند نہیں ہے۔ جس کے اقربار اعزہ میں حاجت مند لوگ نہیں ہوتے۔ اگر ان لوگوں کی وہ مدد کیا کریں ان کو کھلایا پلایا کریں اور زکوٰۃ کی نیت کر لیا کریں تو یہ بھی ان کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ تم میں بعضوں نے روزے چھوڑ رکھے ہیں۔ خصوصاً جو فوجی ملازم ہیں کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہیں۔ یعنی جو محنت انہیں برداشت کرنی پڑتی ہے اس کے ساتھ روزے نہیں رکھ سکتے ـــــ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تم نے راہ غلط کر دی ہے اور تم حکومت کے سینہ پر بوجھ بن گئے ہو۔ بادشاہ جب اپنے خزانہ میں اتنی گنجائش نہیں پاتا جس سے تمہاری تنخواہ ادا کرے تب رعایا پر زندگی کو دشوار کرتا ہے۔ سپاہیو! یہ تمہاری کیسی بری عادت ہے ـــــ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو روزے رکھتے ہیں لیکن سحری نہیں کرتے۔ اور رمضان میں ان سخت کاموں کو نہیں چھوڑتے۔ جن کی وجہ سے روزے ان پر گراں گزرتے ہیں۔

آخر میں فرماتے ہیں :-

ملاء اعلیٰ کی طرف سے اصلاحی مطالبات کا اس زمانہ میں جن جن امور کے متعلق تقاضہ ہو رہا ہے۔ اس کا ایک طویل باب ہے کھڑکی سے آدمی بڑی نیکیوں جہاں تک سکتا ہے اور ڈھیر کے لیئے اس کا نمونہ کافی ہے۔

مَیں نے قصداً شاہ صاحب کے ان دعوتی پیغاموں کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ جس سے اس کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ عام طور پر مسلمانوں کے ہر طبقہ کی ہندوستان میں کیا حالت ہو چکی تھی۔ نیز اسی سے حضرت شاہ صاحب کے اندرونی جذبات و احساسات کا بھی سراغ مل سکتا ہے کہ ان کی نگاہیں کہاں کہاں تھیں۔ جو لوگ ان کی کتابوں کو حنفیت، شافعیت، تقلید و عدم تقلید یا صرف تصوف و کلام کے متعلقہ مباحث تک محدود خیال کرتے ہیں ان کے لئے بھی ان تقریروں میں تنبیہ ہے۔ چاہئے کہ شاہ صاحب کے خدمات کی قیمت لگاتے ہوئے ذرا زیادہ بلند نظری سے وہ کام لیں۔

ہندی مسلمانوں کا جمود یا مرنے کا تہیہ

خلاصہ یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے تکوینی طور پر بھی مسلمانان ہند کو مسلسل الارم دیا جا رہا تھا اور تشریعی حیثیت سے پیغمبروں کے صحیح جانشینوں کو اٹھایا جا رہا تھا جو انہیں بار بار چونکا رہے تھے، جگا رہے تھے۔ لیکن وہ اپنی جگہ کچھ فیصلہ کر چکے تھے۔ ان کے بڑوں اور چھوٹوں نے گویا مرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

ادھر مرہٹوں کا نازک ترین مرحلہ محض اللہ کے رحم و کرم سے طے ہو گیا تھا چاہئے تھا کہ آنکھیں کھل جاتیں لیکن شاہ صاحب کے جو کچھ مطالبات تھے ان میں سر مو فرق نہ ہوا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں فساد کے ایک جرثومہ کی جڑ نکل گئی۔ بلکہ سچ یہ ہے۔ کہ شاہ ابدالی غازی نے سکھوں کی قوتوں پر بھی مختلف ضربیں ایسی لگائی تھیں کہ پنجاب کے مسلمان اگر چاہتے تو وقفہ کی ان گھڑیوں میں جاگ سکتے تھے۔ لیکن وہ اسی طرح سوتے رہے جیسے پہلے تھے۔ گویا ان کو کالا سونگھ گیا تھا۔

قدرتی قانون کے مطابق اس خواب غفلت کی سزا انگریزی اقتدار کا آغاز

آخر قدرت کے قوانین جو اٹل ہیں وہی کام کرتے رہے ادھر ان اندرونی فتنوں کی شدت میں کچھ کمی ہوئی۔ لیکن شمال مشرق اور جنوب مشرق کے ساحلی کناروں سے وہی قوم جس کے متعلق مسلمانوں کے اہل لغت کبھی یہ لکھا کرتے تھے کہ

انگریز بروزن رنگریز قومی ست از نوع انسانی کہ گاہ گاہ بہ کنارِ دریا ظاہر مے شود۔

انگریز کا لفظ رنگریز کے وزن پر ہے یہ انسانی نوع کی ایک قسم ہے جو کبھی کبھی سمندر کے کنارے نمایاں ہوتی ہے۔

تو ان ہی دنوں میں جب پانی پت کے میدانوں میں مرہٹوں کا یہ فیصلہ ہو رہا تھا۔ قدرت کسی اور فیصلہ کا انتظام کر رہی تھی۔ بنگال کے ناظم سراج الدولہ

کی فوج لارڈ کلیف (المشہور بہ کلایو) کے اس شبخون حملہ سے بدل اندوستہ رفتہ ہو چکی تھی جس میں غالباً پہلی دفعہ چقماقی بندوقوں کے چلانے والوں کو کارتوسی گولیوں کا تجربہ ہوا تھا۔ طباطبائی نے لکھا ہے کہ کلایو اور اس کے ساتھی

سراج الدولہ کی فوج پر کارتوسی بندوقوں کے ساتھ لارڈ کلایو کا پہلا شبخون حملہ

سلطنے [illegible] از شب بیتابانہ [illegible] تر [illegible] کشتی فرود آمده از طرف پشت لشکر تفنگ افگنان داخل شدند، فاصلہ در تفنگ نداده قدم بقدم راه می پیمودند و گولہ تفنگ چون تگرگ بلا بر سر لشکریان سراج الدولہ می بارید۔

کچھ رات رہے بہت سے انگریز کشتی سے اتر کر سراج الدولہ کی فوج کے پشت کی طرف سے بندوقیں سر کرتے ہوئے اس کی فوج میں گھس گئے وہ بارود بھرنے میں وقفہ نہیں دیتے تھے اور مسلسل مارچ کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے تھے اور بندوق کی گولیاں اولوں کی طرح سراج الدولہ کے فوجیوں پر برس رہی تھیں۔

ظاہر ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کو "گولہ تفنگ چون تگرگ" کا پہلی دفعہ تجربہ ہوا تھا وہاں نہ ڈھال کام آتی تھی نہ نیزہ نہ تلوار اور نہ اس کے ہاتھ اور قلیتے سے نتیجہ یہ ہوا کہ

سراج الدولہ کے لشکر میں ابتری اور قیامت کا نمونہ

بہ مشاہدہ ایں دستبرد گرد خیز کرد شہ — اس بھاگ دوڑ میں قیامت کا نمونہ

معت [illegible] کار [illegible] گشتہ بود
[illegible]
[illegible] گرفت

سراج الدولہ کی چھاؤنی میں قائم ہو گیا تھا۔ لوگوں کے دل قابو سے نکل گئے۔ دلوں میں سخت خوف و ہراس نے جڑ پکڑ لی۔

[illegible] پلاسی کے سانحہ سے تین سال پہلے پیش آیا تھا۔
[illegible] تلنگ کے مقابلہ میں ہندی سپاہیوں میں پھر کبھی
[illegible] پلاسی کے مشہور میدان میں اس لئے کہ

[illegible] ہوادار [illegible] و دیگراں [illegible] این فساد

وخواہاں شکست سراج الدولہ بودند
از دور جائیکہ تعین بودند استادہ
تماشائے می نمودند۔

میر جعفر خاں اور دوسرے لوگ جو اس فساد کے بانی مبانی تھے اور سراج الدولہ کی شکست کے آرزو مند تھے جس مقام پر متعین تھے۔ دور ہی سے کھڑے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے۔

جو مقدر تھا وہ پورا ہوا۔ اپنے نمک حرام، طوطا چشم ملازم میر جعفر کا قیدی سراج الدولہ محمدی بیگ سے جو اس کے قتل کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ

آیا ماضی لمی شوند کہ در گوشہ
افتادہ زندگی کنم

کیا (میر جعفر وغیرہ) اس پر بھی راضی نہیں ہیں کہ کسی گوشہ تنہائی

میں پڑا میں زندگی گزار دوں؟

لیکن اس کے باپ اور نانا کے نمک پروردہ محمدی بیگ نے

سراج الدولہ کا لرزہ خیز قتل

وضربتے چند بر سیکیہ نازنین او زد — اور چند تلوار کے وار اس نازنین پیکر پر اس نے کئے وہ زمین پر گر پڑا

بعضے زمین افتاد گفت بس است کہ من — اور بولا بس کرو میرا کام تمام ہو گیا

کار من تمام شد مقام بانجام رسید — اور مقام اپنے آخری انجام کو پہنچ گیا۔

اپنے پایۂ تخت مرشد آباد کے بازاروں میں سراج الدولہ کی لاش

وہیں مرشد آباد جہاں بنگال و بہار و اڑیسہ کے مسند السلطان خود مختار بادشاہ کی سواریاں شاہانہ تجمل و شکوہ سے روزانہ نکلا کرتی تھیں آج اس کی

نعش او بر خرطوم فیلے انداختہ — لاش ایک ہاتھی کے سونڈ پر ڈال کر

بطور تشہیر در شہر گردانیدند — بطور تشہیر شہر میں پھرائی گئی۔

اور میر جعفر کی کھال اوڑھ کر کرنل کلیف (کلایو) اور اس کے جانشینوں نے کمپنی بہادر کے نام سے سرزمین ہند پر اس تخت کو بچھا دیا۔ جو آج تک بچھا ہوا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو انعازی الابدالی جس شاہ عالم اور شجاع الدولہ کے سپرد کر کے خود قندھار روانہ ہو گئے تھے حضرت شاہ صاحب کی وفات کے تقریباً دو سال بعد کلایو نے بمقام الہ آباد مشہور

بنگالہ بہار اڑیسہ کی دیوانی کی سند کمپنی بہادر کے نام

فرمان اسناد دیوانی [illegible]

بنگالہ، بہار، اڑیسہ بنام [illegible] شجاع الدولہ و بادشاہ (شاہ عالم) درخواست دیوانی ناچار قبول نمودہ و بہ خواہش ایشان فرامین اسناد نوشتہ دادند۔

تینوں صوبے بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی کی سند کمپنی بہادر کے نام وزیر (شجاع الدولہ) اور بادشاہ (شاہ عالم) نے بیاہی اور چار و ناچار دیوانی کو قبول کرنا پڑا۔ اور ان کی خواہش کے مطابق اسناد کے فرامین لکھے گئے

اتنے بڑے بڑے صوبوں کی کل انگلستان کی [illegible] لاکھ مقرر ہوئی اور چالیس ہزار سالانہ ناظم بنگالہ کے اخراجات کے لئے طے ہوئے اور

قبولیت بہ مہر کمپنی کردست آویز تعہد مالگزاری است داخل دفتر پادشاہی گردید

کمپنی کی مہر کے ساتھ قبولیت نامہ جو مالگزاری کے معاہدہ کی دستاویز تھی بادشاہی دفتر میں داخل ہوئی۔

بقول طباطبائی اتنا اہم کام اتنی آسانی سے انجام پا گیا۔

کہ بیع و شرائے خر بار بردار و چارپائے رہوار ہم بایں زودی بدون تکرار یکسوئی نمے شود۔ انفصال و انفتاح یافتہ۔

کہ کسی بوجھ لادنے والے گدھے اور کسی چوپایہ کی خریداری بھی اتنی جلدی بغیر کسی رد و کد اور تکرار کے طے نہیں ہوتی لیکن یہاں اتنا بڑا معاملہ طے پا کر ختم ہو گیا۔

"تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء" کی پھر
ب تفسیر گنگا جمنا کے سنگم پر لکھی گئی۔ شاہ عالم نام کو ہندوستان کے
دشاہ تھے۔ لیکن کرنل اسمٹ جوان کی نگرانی کے لئے الہ آباد میں چھوڑا
یا تھا۔ اس کا یہ حال تھا کہ :-

رنگی ٹھیکہ داروں کی نزاکت دماغی	ازصدائے	بادشاہی
اہی نقارہ کی آواز سے سر میں درد	نقارہ نوبت	نوبت خانہ
	خانہ پادشاہی	کی آواز سے

در قلعہ بود گاہے ناخوش گشتہ	ناخوش ہوتا تھا اور نقارہ کے
اختن نوبت را مانع می شد و مردم	بجانے میں مانع ہوا۔ نقارہ بجانے
ارہ خانہ ناچار ممنوع از عمل خود بودند	والے مجبوراً رک گئے۔

سچ ہے :-

تانہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

ان "ٹھیکہ داروں" کی نزاکت دماغ اب کیا کہنے تھے :-

ٹھیکہ چکالو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے
فانا للہ وانا الیہ راجعون

ظاہر ہے دین کا وہ دیوانہ جو مسلسل پچاس ساٹھ سال سے آسمان کے
ا بدلے ہوئے تیوروں کا اندازہ کر رہا تھا۔ اس کی اندرونی تڑپ اور
بے چینی کبھی کبھی ابدالی اور حافظ الملک رحمت خاں، شجاع الدولہ ادھر قاسم

کی شکلیں بن بن کر نمایاں ہوتی تھیں۔ لیکن جن کے لئے وہ تڑپتا تھا۔ وہ تو سوئے ہوئے تھے کیا کرتا۔ کب تک اپنے جگر کے نالوں سے آسمان کرہلاتا۔

آخر عمر میں شاہ ولی اللہ کی دردناک وصیت

آخر عمر میں جب وصیت نامہ ترتیب دینے لگے۔ تو جہاں اور باتیں لکھیں ان میں سب سے زیادہ دردناک وصیت وہ ہے جسے پڑھ کر کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے دارالسلطنت پایۂ تخت میں بیٹھ کر اسی سلطنت کا ایک عالم لکھتا ہے اور حالات نے جو رخ لیا تھا اس کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد لکھتا ہے۔

ما مردم غریبیم کہ در دیار ہندوستان	ہم لوگ اجنبی مسافر ہیں کہ ہمارے
آبائے ما بغربت ... آمدہ اند۔	باپ دادا اس ملک میں بحالت مسافرت
(وصیت نامہ ص ۱۱)	وغربت یہاں داخل ہوئے۔

(اردو ترجمہ ...)

حضرت کے کلام اور مختلف کتابوں سے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اپنی قوم کی اس حالت کا خاص اثر تھا وہ دیکھ رہے تھے کہ اگر یہی لیل ونہار ہیں تو اس ملک میں اب دین اور اہل دین کا بس خدا ہی حافظ اور اب اس میں شک کی گنجائش ہی کیا باقی تھی جو کچھ ہونے والا تھا اس کی صبح بلکہ صبح سے بھی زیادہ روشنی طلوع ہو چکی تھی۔ قوم کی تقدیر ان پر واضح ہو چکی تھی۔

۱۱۴۳ھ میں حالات کی نزاکت کے باوجود شاہ صاحب کے سفر حجاز کا اصل راز

اور آج ہی نہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ۱۱۴۳ھ میں جب آپ کی عمر تقریباً ۳۰ سال کی تھی اچانک آپ کا سفر حجاز کے لئے آمادہ ہو جانا، اور ایسے زمانہ میں اس خطرناک ارادہ پر عمل کر گزرنے کی ٹھان لینا جب بحر عرب، بحر ہند اور بحر احمر کے تمام سواحل پر تگیزی، ولندیزی قزاقوں اور فرانسیسی و انگریزی تاجر صورت ملک گیروں کی بحری ترک تازیوں کے جولان گاہ بنے ہوئے تھے۔ علانیہ حاجیوں کے جہاز لوٹے جاتے تھے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں بلکہ ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ یوں بھی شمالی ہند سے جنوبی ہند کے علاقوں کو طے کر کے سورت کی بندرگاہ تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ خشکی میں ہر جگہ خصوصاً صوبجات متوسط اور مالوہ گجرات جو بندرگاہ کے راستہ پر واقع تھے۔ مرہٹوں کی شورشوں کی خصوصی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ تاہم شاہ صاحب راہ کی ان تمام دشواریوں کے باوجود عزم حجاز کو پورا کر کے رہے راستہ کا یہ حال تھا کہ بات کو اگر کوئی ساتھی کسی گاؤں یا آبادی میں بھی چھوٹ جاتا تھا تو شاہ صاحب "یا بدیع العجائب یا بدیع العجائب" کا وظیفہ شروع کر دیتے تھے جس کے یہ معنی ہیں کہ گویا ایسے آدمی کا بچ کر خطرہ سے نکل آنا ایک اعجوبہ روزگار بات تھی۔ بہرحال میرے نزدیک علاوہ حج و زیارت اور دوسرے مقاصد کے ایک بڑا محرک جیسا کہ آئندہ بھی اس پر کچھ بحث کی گئی

مسلمانانِ ہند کے تاریک مستقبل کا احساس بھی تھا جس کی امت سرزمین ہند میں اس حال میں گرفتار ہونے والی تھی کہ ان تک خبر پہنچائی گئی اور جہاں کی دعائیں رد نہیں ہوتیں وہاں بھی کچھ عرض کرنا چاہیئے تھا۔ اسی سلسلہ میں ان کو مکہ معظمہ میں وہ خواب دکھلایا گیا جس کا ذکر گزر چکا۔ اور مدینہ منورہ میں یہ سرفرازی نصیب ہوئی کہ خود ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست اس بشارت سے مفتخر فرمایا کہ

ان مراد الحق فیک ان	تمہارے متعلق خدا کا ارادہ ہو چکا ہے
یجمع شملا من شمل الامۃ	کہ امت مرحومہ کے جتھوں میں سے
المرحومۃ بک	کسی جتھے کی تنظیم تمہارے ذریعہ سے
(صفحہ ۶۲ فیوض)	کی جائے۔

میرے خیال میں یہ ہندوستان ہی کی امت مرحومہ تھی جس کی پراگندگیوں کی تنظیم کا کام ایک خاص آلہی تدبیر سے حضرت اور حضرت کے دودمان اور "ذریات طیبات" سے لیا گیا۔ اس مضمون کو کسی آئندہ مناسب مقام پر ذرا تفصیل سے انشاء اللہ عرض کروں گا۔

شاہ صاحب نے ہندوستان کو بالکل خیرباد کہہ کر حجاز ہی میں اقامت کیوں نہیں کر لی

بالفعل یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسی حالت میں جب شاہ صاحب ہندوستان کو چھوڑ چکے تھے اور ایک دوسری صورت بھی آپ کے سامنے تھی یعنی بجائے اس مسافرت کی مصیبت اور غربت کا ازالہ جس کا احساس انہیں اس

ملک میں تو ہو چکا تھا یوں بھی تو کہ سکتے تھے کہ بجائے غربت اور مسافرت کی مصیبت کے ملک حجاز ہی میں رہ پڑتے کیونکہ گو ان ممالک کی خیر بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور مسلمان جن علاقوں کو اب تک اپنا وطن سمجھ رہے تھے مستقبل کی گھڑیوں پر نظر رکھنے والے وہاں بھی ان کی غربت اور مسافرت کو دبے پاؤں آتا ہوا دیکھ رہے تھے لیکن پھر بھی

جو بیجر تکرکے بھی جائیں تو ملت شبلی کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیروان کب تک

کی حالت پیدا نہ ہوئی تھی۔ بالخصوص سرزمین حجاز تو ترکی اور مصری سلطنتوں کے بیچ میں بہت کچھ قابل بھروسہ تھی پھر اس مقدس ملک میں آپ کو قیام کا بھی کافی موقع ملا۔ مختلف مقامات میں آپ کو مختلف اشارے بھی ہوتے رہے اور طرح طرح کے مکاشفے مختلف رنگوں میں ہوئے مگر ان میں کسی جگہ بھی آپ کو اس کا ایما نہ کیا گیا کہ ہندوستان کی واپسی کا ارادہ ترک کر دیں یہی نہیں بلکہ آپ کے بعض متوسلوں نے ہندوستان کی ان حالتوں کو دیکھا کر جب چاہا کہ حجاز سے واپس نہ ہوں اور وہیں رہ پڑیں اور مشورۃً شاہ صاحبؒ کو اس بارہ میں خط لکھا تھا آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ

واما عزمہم ترک الرجوع	اور یہ ارادہ کہ وطن کی طرف اب
الی الوطن فلا تبتدر اکہنہ	واپس نہیں ہونا چاہئے تو اس پر
حتی یشرح اللہ صدرکم او	اصرار نہ کرو جب تک خود تمہارا
صدر رجل لاجلکم	سینہ نہ کھل جائے یا کسی اور شخص

(مکاتیب حیات ولی ص۲۹۱) (یعنی خود شاہ صاحب) کو شروع صدر
تمہارے لئے نہ ہو جائے۔

بلکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امت مرحومہ کے جس طبقے کے "شمل" کے اجتماع کی آپ نے بشارت پائی تھی۔ اس کے لئے بہر حال "امن عالم غربت" میں مرنا اپنے لئے پسند کرتے تھے۔ حتیٰ کہ حالات جب روز بروز بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے اور آپ کو اس کا یقین ہو گیا۔ کہ اب اس ملک پر مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ اور بہر حال غیر اسلامی قوتوں کا اس پر اقتدار قائم ہی ہو جائے گا۔ تو اب چاہئے آپ اسے اپنے دل کی تسلی خیال کیجئے یا جہاں اور بہت سی چیزیں انہوں نے "غیبی اشارات" کے تحت لکھی ہیں۔ اس کا بھی اعلان کسی گمان غالب کے تحت میں نہیں بلکہ یقین و اعتقاد کی صورت میں کیا ہے۔

شاہ صاحب کی ایک محیر العقول توقع

والذی اعتقدہ ان اتفق غلبۃ الھنود مثلا علی اقلیم ھندوستان فلمہ مستقرۃ عامۃ واجب فی حکمۃ اللہ تعالیٰ ان یلہم رؤسائہم المتدین

اور جس بات کا مجھے یقین ہے وہ یہ ہے کہ اگر مثلاً ہندوؤں کا ہندوستان کے ملک پر تسلط قائم ہو جائے اور یہ تسلط مستحکم اور ہر پہلو کے اعتبار سے ہو۔ جب بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت کی رو سے یہ واجب اور ضروری ہے کہ ہندوؤں کے سرداروں اور لیڈروں کے دل

بدین الاسلام | میں یہ الہام کرے کہ وہ دین اسلام
(تفہیمات الٰہیہ ص۱۰۳) | کو اپنا مذہب بنا لیں۔

غالباً آپ کی یہ تحریر "پانی پت" کے تقدیری فیصلے سے پہلے کی ہے اور خاص کر اسی قوم کے تسلّط کے خیال کو انہوں نے تمثیل کی شکل میں پیش کیا ہے۔ بہر حال ہندوستان کے متعلق

"پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے میں"

ان کا نظریہ بلکہ عقیدہ تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ غالباً اسی نظریہ کے موجد اوّل بھی وہی ہیں کیونکہ انہوں نے لکھا ہے کہ "کما اصطلح الترک" یعنی جیسے ترکوں کو قبول اسلام کی الہامی توفیق ہوئی اور جو اسلامی جھنڈے کو سرنگوں کر رہے تھے۔ خود اس کے آگے سرنگوں ہو کر صدیوں اسلامی علم کے دنیا میں تنہا علم بردار رہے۔

شاہ صاحب اور نظریۂ وطنیت

لیکن باوجود اس خیال کے کہ "غربت و مسافرت" کی حالت میں بھی سرزمین ہند کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کا خیال کبھی نہیں پکایا کہ بجائے عرب کے اپنا مرکزی تعلق بھی ہم ہندوستان ہی سے قائم کرلیں، اپنی اسی وصیت میں شدت کے ساتھ اصراراً لکھتے ہیں :۔

ما را لا بدست کہ بحرمین محترمین رویم و روئے خود را برآں آستانہا مالیم۔ | ہم مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے کہ حرمین محترمین ہم جایا کریں اور اپنے چہروں کو ان آستانوں پر جا کر ملا کریں۔

اور آخر میں دو ٹوک قطعی فیصلہ کی صورت میں ارقام فرماتے ہوئے نظریۂ "وطنیت" کی جو واقعی جڑ ہے اس پر تیر لگاتے ہیں۔

سعادت ما اینست و شقاوت ما در اعراض ازیں — ہماری سعادت اور کامیابی اسی میں ہے۔ اور ہماری بدبختی و شقاوت اس مسلک سے روگردانی اور اعراض کرنے میں ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے آج "ہندی قومیت" "انڈین نیشنلسٹی" کی راہ کا جو سب سے بڑا کانٹا خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمان جسم کو اپنے تو رکھتے ہیں ہندوستان میں لیکن دل ان کا رہتا ہے مکہ اور مدینہ میں، کہا جاتا ہے اور علانیہ کہا جاتا ہے کہ جب تک یہ ڈوری کاٹ نہیں دی جائے گی۔ اس ملک میں "صحیح وطنیت" کا جذبہ کبھی بار آور نہیں ہو سکتا اور سچی بات بھی یہی ہے کہ وطن پرست ہی نہیں بلکہ ایک اچھے وطن دوست کے لئے بھی یہ بات دنیا کی نظر میں قابل تعجب ہو سکتی ہے اور ضرور ہو سکتی ہے کہ رہتا ہے وہ ہندوستان میں اور ہر تھوڑی دیر بعد وہ سر جھکاتا ہے۔ اس خطہ کی طرف، اس ملک کی طرف، اس سمت کی طرف اور اس قبلہ کی طرف جو ہزاروں میل سمندر پار ایک ریگستان میں ہے" وطن پرستوں" کے نزدیک تو یہ طریقہ غلط اور اتنا غلط ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس کا خاتمہ کر دینا چاہئے۔ لیکن وطن پرستوں کے ایک حلقہ میں بھی اس کی لاسود کوشش جاری ہے کہ دونوں نظریوں میں تطبیق دیجائے

اور "ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ" کے قدرتی قانون کو توڑ کر چاہا جاتا ہے کہ ایک ہی آدمی کے سینے میں دو دل بنا دئے جائیں ——
ایک اللہ والے کا، دوسرے اللہ کا اضافہ اپنے معبودوں، مطلوبوں، مقصودوں میں کیونکر کریں۔

بہرحال جس کی جو سمجھ میں آرہا ہے کر رہا ہے۔ اور ذاتی طور پر میں ان خیالات میں کسی خیال کی ترجیح کی صلاحیت اپنے اندر نہیں پاتا لیکن حضرت شاہ صاحب کا خیال یہی تھا کہ مسلمانوں کی ساری سعادت اسی میں ہے کہ وہ اپنا مرکز حرم کی زمین پاک ہی کو بنائے رکھیں۔ اور ان کی پوری بدبختی یہی ہے کہ کسی حیثیت سے بھی وہ ان دونوں مقدس مقاموں سے الگ ہو جائیں۔

حجازی تہذیب اور مسلمانوں کے امتیازی طریقۂ زندگی کے بارہ میں شاہ صاحب کا تشدد

اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ اپنی مختلف کتابوں کے مختلف مقاموں پر منجملہ چند کلی امور کے شاہ صاحب جس پر بالکل بے اختیار ہو کر بپھر جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ کسی ملک میں اپنی ابتلائی زندگی گزاریں لیکن بہرحال اپنی وضع قطع اور طرز بود و ماند میں ان کو اس ملک کے مقامی باشندوں سے قطعاً جدا رہنا چاہئے اور جہاں کہیں رہیں اپنی عربی شان اور عربی رجحانات ہی میں ڈوبے رہیں۔ اسی وصیت میں فرماتے ہیں اور اپنے اس خیال کی توجیہہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :—

عربیت نسب، عربیت لسان ہر دو فخر ماست کہ ما السید الاولین والآخرین وافضل انبیاء والمرسلین ولفخر موجودات علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات نزدیک مے گرداند۔

عربی نسل، عربی زبان، یہ دونوں چیزیں ہمارے لئے فخر ہیں کہ انہیں دونوں نسبتوں سے ہم سید الاولین والآخرین افضل الانبیاء والمرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات سے نزدیک رہتے ہیں۔

پھر اس کے بعد اور صراحت کرتے ہیں کہ

شکر نعمت عظمیٰ آں ست کہ بقدر امکان عادات و رسوم عرب اول کہ منشاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم است را از دست ندہیم۔

اس سب سے بڑی نعمت کا شکر یہی ہے کہ حتی الوسع عرب اول کے عادات و رسوم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء ہے۔ اس کو ہم اپنے ہاتھوں سے نہ چھوڑیں۔

شاید ہمارے ہی بعض حلقوں میں قیامت کا شور برپا ہو جائے گا اور غل مچایا جائے گا۔ جب ان کو سنایا جائے گا کہ یہی امام ولی اللہ جن کو ہندی نیشنلزم اور "قومی پالیسی" کے پہلے علمبردار لیڈر ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اپنی اسی وصیت میں آگے فرماتے ہیں کہ

رسوم عجم و عادات ہنود را درمیان خود نگذاریم

عجم (غیر عربی اقوام) کی رسمیں اور ہندوؤں کی عادتوں کو چاہیئے کہ ہم اپنے اندر کسی طرح باقی نہ رکھیں۔

اب للہ مجھے بتاؤ۔ کہ جب شاہ صاحب ہی کا نام لے کر مسلمانوں کو لباس اور وضع قطع تک میں غیروں کے قدم بقدم چلنے کا مشورہ دیا جائے اور مجھے اس پر حیرت اور غصّہ ہو تو کیا قصور وار میں ہی ہوں؟

انصاف! انصاف!! اے اہل انصاف! للہ انصاف!!!

اور اسی ایک جگہ کو نہیں "زیِ الاعاجم" (غیر عربی اقوام کے فیشن) کے متعلق آیا ک ایاک کی صدا شاہ صاحب نے اپنی کس کتاب میں نہیں لگائی ہے۔ آپ نے ایک مکتوب میں اس کا اندازہ کر کے کہ "وضع وقطع" یا فیشن کی تبدیلی کا عارضہ پہلے کھاتے پیتوں اور ان ہی لوگوں کو پکڑتا ہے۔ جو تھوڑی بہت معاشی فراغبالی رکھتے ہوں۔ جس کا شاہ صاحب کو تو فقط اندازہ ہوا تھا۔ اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کا تماشہ کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس زمانہ میں "امیروں" کی حقیقت پر "تعلیم یافتگی" کی چادر اوڑھا دی گئی ہے اور جب ارباب ثروت و فراغت کا ذکر آتا ہے۔ تو عموماً لوگوں کا ذہن پیلے جاگیرداروں اور زمینداروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مدت ہوئی۔ کم از کم مسلمانوں میں تو اس طبقہ کا گویا خاتمہ ہو چکا ہے اور اب ان کی جانشینی کا کام وہی لوگ انجام دے رہے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے موجودہ حکومت کے متوسلین میں ہیں' ان میں وہ سارے عوارض پیدا ہو چکے ہیں جو عموماً امیروں اور امیرزادوں کے ساتھ خاص ہے لیکن ایک لفظ "تعلیم یافتہ" بول کر خود ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی ان کو امراء واغنیاء

کے جرگہ سے باہر کر دیتے ہیں اور اب جو کچھ امیروں کے متعلق سنا جاتا ہے۔ سمجھتے ہیں کہ اس کا نشانہ "تعلیم یافتوں کا معاشی وسعت رکھنے والا گروہ نہیں ہے۔ بہر حال شاہ صاحبؒ نے اس خط میں چند خاص طبقات سے مکتوب الیہ کو پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں :-

اہل عجم کے فیشن اختیار کرنیوالوں سے شاہ صاحبؒ کی بے زاری

ایاک و غنی طاغ متکلف زی الاعاجم و متداخل فی مضاربة الجماجم

(منقول از حیات ولی صفحہ ۳۹۰)

خبردار! بچے رہنا اس تونگر امیر سرکش سے جو خواہ مخواہ غیروں (عجمیوں) کے فیشن کو زبردستی اختیار کرتا ہے اور جو لوگ صحیح راہ سے منحرف ہیں۔ ان سے برابری اور مقابلہ کے میدان میں گھسا پھرتا ہے۔

موجودہ اصطلاح کے "تعلیم یافتوں" اور پرانے محاورہ کے تونگروں امیروں میں یہ دونوں خصوصیات کتنے بہتر طریقے پر پائی جاتی ہیں۔ لیکن شاہ صاحب بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ آئندہ وقتوں میں ارباب غنا و ثروت تو اپنی امارت و تونگری کی وجہ سے بہ تکلف زبردستی غیروں کی ریس کریں گے۔ لیکن جو غربت کی وجہ سے اس مرض سے محفوظ رہینگے ان کے سر ان ہی کی امامت اور قیادت کے نام سے غیروں کے لباس اور معاشرت کے منڈھنے کی کوشش کی جائیگی۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

پھر شاہ صاحب نے ہندوستان کو کیوں نہیں چھوڑا

اس قصہ کو مختصر کر کے مَیں پھر اپنے اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یعنی بہر حال شاہ صاحب کے گزشتہ بیانات سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ان مصائب کو دیکھتے ہوئے بھی اور اس کا بھی اندازہ لگاتے ہوئے کہ زوال کی یہ حالت ابھی دور تک جائے گی۔ شاہ صاحبؒ نے "ہندوستان" چھوڑنے کا ارادہ کبھی نہیں فرمایا اور نہ کسی کو اس کا مشورہ دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والے کروڑوں مسلمانوں کو ان کے حال پہ چھوڑ کر محض اپنی تن آسانی کے لئے ملک سے باہر نکل جائیں گویا ہے

ناہنداشت تاب جمالِ پری رُخاں
کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

درحقیقت کشمکش حیات سے کسی طرح پیچھا چھوٹ نہیں سکتا

حالانکہ جب زندگی ابتلائی کشمکشوں ہی کا نام ہے۔ اور جو بھی جہاں کہیں بھی جس حال میں ہے۔ وہ ع۔ "زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے" ــــــ کی چخ میں مبتلا ہے۔

حتیٰ کہ ایک ملک، ایک مذہب، ایک رنگ، ایک معاشرت رکھنے والا یورپ آج جن قیامت خیز مصیبتوں کا شکار ہے۔ اس سے زیادہ کا تو شاید تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور آج کیا کب ایک صدی بھی باایں ہمہ

اتحاد و اشتراک و تعلیم و تہذیب و رواداری اس ملک میں خون کی ندیاں نہیں بہی ہیں، سروں کو گردنوں سے نہیں اڑایا گیا ہے اپنے ہی ہم مذہبوں نے خود اپنے مذہب والوں کی عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم نہیں کیا ہے گھروں میں آگ نہیں لگائی ہے۔ مال و دولت کو تاخت و تاراج نہیں کیا ہے ——— ہاں تو پھر "تم خیراً" کے خیالی منصوبے پکانا کہ یہاں سے چھوڑ کر دوسری جگہ جب چلے جائیں گے تو عافیت نصیب ہو گی۔ اور جس آسمان کے نیچے یہاں ہیں کسی دوسری زمین میں وہ آسمان بدل جائے گا خام خیالی نہیں تو کیا ہے؟ ——— بلاشبہ بعض اوقات خاص حالات میں قومیں اس فعل پر بھی مجبور ہوئی ہیں۔ اور مجبوری ارادی نہیں بلکہ مجبوری ہی کی شکل میں آتی ہے۔ اس وقت اس پر عمل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور ایسی حالت میں عمل نہ کرنے والے اپنی قومی و ملی خصوصیات کو کھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن ہر تھوڑی پریشانی کے بعد پیٹھ پھیر کر مورچہ چھوڑ دینا اور اسی کو عقل زمانے کا حکم قرار دینا میرے خیال میں بزدلی ہی نہیں۔ بلکہ ان لاکھوں بلکہ کروڑوں بیکسوں کمزوروں کے ساتھ غداری بھی ہے جنہیں دشمنوں کے پنجوں میں پھڑپھڑانے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ حتی الوسع حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے اور اپنے سے زیادہ ان بے وسیلہ غریب ہم قوموں کا خیال کرنا چاہئے جو اپنے اندر بھاگنے کی سکت بھی نہیں پاتے ——— میرا خیال ہے کہ شاہ صاحب نے اسی خیال سے ہندوستان کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں فرمایا۔ اور اپنے

کو اس حد تک راضی کر لیا۔ کہ اگر خدانخواستہ اس پر ہنود کا عام اور تام دخل و قبضہ بھی ہو گیا تو اس وقت بھی ان کو یقین تھا جیسا کہ پہلے بھی یقین دلایا گیا ہے کہ "وہی نہیں جن پر ہم گرتے ہیں بلکہ وہ بھی جو ہم پر گریں گے ان کو چکنا چور ہونا پڑے گا۔" اسلام کی مادی تاریخ بجائے پہلی صورت کے دوسری صورت کی شہادتیں اپنے اندر زیادہ تعداد میں رکھتی ہے۔ عرب گرا چور ہوا، ایران گرا بھسم ہو گیا، مصری ہم پر ٹوٹے ان کو ٹوٹنا پڑا ـــــ ترک جھپٹے لیکن ہم ہی نے ان کو اپنے جھپٹے میں لے لیا ـــــ اور یہ بھی تو سوچنا چاہئے۔ کہ ہمارا نصب العین صرف خود ہی جینا نہیں ہے بلکہ اسی کے ساتھ دوسروں کو جلانے کا کام بھی تو ہمارے سپرد ہے اور بقول حضرت شاہ صاحب کے "ختم نبوت" کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ پہلے تو شخصی انبیاء اٹھائے جاتے تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں جب ایک امت ہی اخرجت للناس کی سند دے کر دنیا کے لئے اٹھائی گئی ہے" پھر اب فالتو نبوتوں کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اور نگرانی کو اس کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے کہ ہم بھی شہداء علی الناس (دنیا کے انسانوں) کے نگران بنے رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہدہ کے بننے کے ساتھ ہی اپنے رسول کی شہادت و نگرانی سے ہم محروم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جس دن سے ہمارا رخ عام انسانوں سے ہٹ کر صرف اپنی جماعت تک

محدود ہو گیا ہے۔ تدریجاً روزان نگہبانیوں کی برکات سے ہم محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی کے لازمی نتائج ہیں۔

کیا کروں بات میں بات نکلتی چلی آتی ہے۔ قلم کو روکتا ہوں لیکن یہ خیال کرکے کہ پھر موقعہ ملے نہ ملے جو کچھ اپنے اندر ہے دوسروں تک پہنچا دیا جائے۔ جذبات دبانے سے نہیں دبتے اور سلف کے حالات سننے یا سنانے کا مقصد بھی صرف سننا یا سنانا نہ ہونا چاہئے۔ ماضی سے مستقبل کی زندگی میں اگر کچھ مدد مل سکتی ہے تو پھر یہ کام کی بات ہے ورنہ بجز ایک دلچسپ داستان کے وہ اور کیا ہے۔

ہندوستان میں قیام اور مستقبل کا کام

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہندوستان ہی میں قیام کا ارادہ طے کرتے ہوئے شاہ صاحب نے یقیناً اپنے عمل کا کوئی پروگرام بنایا۔ اگرچہ بہ تفصیل انہوں نے اپنے دستور العمل کے ضوابط کو کسی جگہ قلمبند نہیں فرمایا ہے۔ لیکن پھلوں سے بھی درختوں کی نوعیت کا پتہ چلایا گیا ہے۔ خود جس کا عمل اس کے منصوبے کی فہرست اگر ہمارے سامنے پیش کرتا ہو تو ہمیں اس کے سمجھنے اور پڑھنے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔

بہرحال میں نے جہاں تک غور کیا ہے اور شاہ صاحب کی کتابوں کی کثرت مطالعہ نے جن نتائج تک مجھے پہنچایا ہے۔ اس کا خلاصہ مختصر الفاظ میں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے زمانہ کے مختلف فتنوں کو دیکھ دیکھ کر

ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ گویا ٹھیک "الطیب النغم" میں جو شاہ صاحب کا پہلا شعر ہے ؎

کان نجوما ومضت فی الغیاھب
عیون الافاعی او رؤس العقارب

(ترجمہ) تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناگوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے سر ہیں۔

وہ سماں ہندوستان میں ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ انہوں نے اندازہ کر لیا تھا اور وہ نہ کرتے تو کون کر سکتا تھا کہ اب ؎

بنے رہو گے تم اس ملک میں یہاں کو تک

یہ دیر یا سویر رہی سہی نام نہاد اسلامی حکومت کے خاتمہ کا وقت قریب آ چکا ہے۔ ان کے سامنے سوال آتا ہوگا کہ آخر ان کروڑوں مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا۔ معاش کا کفیل تو رزاق مطلق ہی ہے۔ جب تک جو جیتا ہے ذو القوۃ المتین۔ بہرحال اس کا انتظام کسی نہ کسی شکل میں کر ہی دیا کرتا ہے۔ اور یوں قناعت کی راہوں کو چھوڑ کر کوئی سینہ کوبی ہی پر مُصر ہو تو آج انگلستان جو نہ صرف سیاسی قوتوں کے ذریعہ سے دنیا کے آباد ترین پیداواروں کا تنہا خرمن ہے۔ بلکہ تجارت صنعت و حرفت، قمار، ربوا الغرض مالی انتفاع کے ممکنہ وسائل کی کنجیاں ساری روئے زمین کی اسی کے ہاتھ میں ہیں اور کس انگلستان کا یہ حال ہے جو اپنے طول و عرض میں بنگال کے کسی متوسط درجہ کے ضلع سے

سے بھی بڑا نہیں ہے۔ آبادی بمشکل صرف چار ساڑھے چار کروڑ تک پہنچتی ہے۔ لیکن با ایں ہمہ ان چار کروڑ میں تقریباً دو کروڑ پیر سن مزدوروں کے "پیٹ پیٹ" کے شور سے آسمان تھرا رہا ہے ——— آئے دن حکومت والوں پر پتھر پھینکے جاتے ہیں، کھڑکیاں توڑی جاتی ہیں، اور جو کچھ ہوتا رہتا ہے۔ روزناموں کے تاروں میں اس کی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ بھلا جس ملک کو خود آزادی ہی حاصل نہیں ہے بلکہ بیسیوں ممالک و اقالیم کی آزادیاں بھی اسی کی آزادی میں ہضم ہو چکی ہیں۔ سیاستہً بھی، تجارتہً بھی، صنعتہً بھی، حرفتہً بھی ——— اور اس کے سوا ہر راہ سے ہر چیز ہر قوم کی اسی انگلستان کے باشندوں میں فنا ہو رہی ہے۔ جب اس کا یہ حال ہے تو جن کا یہ خیال ہے کہ صرف غیروں سے آزاد ہو کر ہم تیس کروڑ انسانوں کی "آواز شکم" کو قناعت کے ذریعہ سے نہیں بلکہ حرص و آز کی بھٹیوں کو بھڑکا کر دبانے میں کامیاب ہوں گے ان کے اس خیال کو خواب و خیال کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ آج جو حضرات عوام کو اپنے جھنڈوں کے نیچے پیٹ بجا بجا کر بلا رہے ہیں اور دنیا کو یہ بتلا اور سمجھا رہے ہیں۔ کہ انسان کے لئے سب سے مقدم اور اہم پیٹ کا مسئلہ ہے۔ اور اعضاء انسانی میں عضو رئیس بس معدہ ہے۔ ان کو "فکر معقول" سے کام لینا چاہئے۔ کہ جس راہ پر آدم کی اولاد کو وہ لے جا رہے ہیں یہ ترکستان جا رہی ہے یا کعبہ پہنچانے کی۔

بہرحال میرے نزدیک شاہ صاحب کے سامنے مسلمانوں کے "شکم" کے غم سے زیادہ زندگی کے اس "سوال اہم" کا "غم" تھا جس کے جواب کے بغیر اس دنیا کی ہر زندگی بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو "انجام" کی درستی کے لئے "آغاز" کا جو دستور خدا کی طرف سے پہنچایا تھا۔ شاہ صاحب دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کو اس پیغام سے جو تعلق ہے۔ ان فتنوں کی پہلی زد قدرتاً اسی تعلق پر پڑے گی۔ اب تک تو ہر مسلمان علاوہ موروثی مسلمان ہونے کے "علی دین ملوکہم" کے قانون کے تحت بھی مسلمان ہی رہنے میں فائدہ محسوس کرتا تھا۔ بلکہ غیروں میں بھی کتنے تھے جو اپنے مسلمان ہونے پر اس زمانہ میں پھپتا تے تھے۔ لیکن جب "ملوک" بدل جائیں گے اور "افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ وکذالک یفعلون"[1]۔ کے مستمر قاعدہ کی بنیاد پر اس وقت اسلام سے وابستگی کا یہ "ملوکی" ذریعہ بھی باقی نہ رہے گا۔ سوال یہی تھا کہ پھر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن مبارک کے ساتھ بندھے رہنے کی ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا شکل ہوگی۔

شاہ صاحب کے زمانہ کے "علماء و مشائخ" کی کمزوریاں | دوسری طرف

[1] قرآن کی آیت ہے کہ ملکہ سبا نے کہا تھا کہ "سلاطین جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو بگاڑ دیتے ہیں اور ملک کے عزت والوں کو خوار و ذلیل کر دیتے ہیں۔"

وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان میں مذہب اسلام کی تعلیم و تعلّم اور نشر و اشاعت کے جو ذمہ دار ہیں۔ ان کے دونوں طبقوں (یعنی مذہب کے ظاہری رسوم و عام عقائد کے محافظ جنہیں عموماً علماء کہتے ہیں اور مذہب کی واقعی روح اور اس کے باطنی مقاصد کے علمبردار جنہیں صوفیہ اور مشائخ کہتے ہیں۔ دونوں گروہوں کا اس زمانہ تک پہنچتے پہنچتے عجب حال ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب کے جس "پیغام" کا ترجمہ پہلے درج کر چکا ہوں، اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے علماء کی کیا حالت تھی۔ کہ اُن کو مخاطب کر کے فرمایا تھا

اشغلتم بعلوم الیونانیین وبالصرف والنحو والمعانی	تم یونانیوں کے علوم اور صرف و نحو و معانی میں الجھے ہوئے ہو۔

فقیہوں کی بے راہ روی اور بے بصری

اور یہ تو عام علماء کا حال تھا، خصوصیت کے ساتھ جنہیں علماء دین کا لقب حاصل تھا۔ اور فلسفہ و منطق سے وہ کام لے رہے تھے جن کا نام فقہا تھا ان کی یہ کیفیت تھی کہ دین کے حقیقی سرچشموں قرآن و حدیث اور ائمہ مجتہدین اور ان کے تلامذہ کے اقوال تک سے بہت دور آ گئے نکل کر ہر وہ چیز جو فقہ کے نام سے کسی کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی۔ ان کے نزدیک "وحی محکم" اور "نص قطعی" کا درجہ حاصل کئے ہوئے تھی اپنی مشہور کتاب "انصاف" میں فقہاء عصر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

فالفقیہ یومئذ ھو الثر ثار	اس زمانہ میں فقیہ اس شخص کا نام

ثاد المتشدق شدقیه الذی حفظ اقوال الفقهاء قویها وضعیفها من غیر تمیز وسردها بشقشقة شدقیه

ہے جو باتونی ہو زور زور سے ایک جبڑے کو دوسرے جبڑے پر پٹکتا ہو۔ جو فقہا کے اقوال قوی ہوں یا ضعیف سب کو یاد کر کے بغیر اس امتیاز کے ان میں سے کس میں قوت ہے۔ کس میں نہیں ہے وہ انہیں اپنے جبڑوں کے زور سے چلا کر بتاتا ہے

(٩٣)

اسی گروہ کے متعلق دوسری جگہ لکھتے ہیں۔ کہ ان کی بے تمیزیوں کا یہ حال ہے کہ خود امام ابو حنیفہؒ ان کے تلامذہ اور بعد کے علماء کے اقوال تک میں فرق نہیں کر سکتے۔

ویزعم ان جمیع ما یوجد فی هذه الشروح الطویلة وکتب الفتاوی الضخمة فهو قول ابی حنیفة وصاحبیه ولا یفرق بین القول المخرج وبین ما هو قول فی الحقیقة ولا یحصل معنی قولهم علی تخریج الکرخی

(یعنی اس زمانہ کے فقیہوں کا) خیال یہ ہے کہ طویل وضخیم شرحوں اور فتاویٰ کی کتابوں میں جو مسائل پائے جاتے ہیں۔ یہ سارے کے سارے امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کے ہیں (یہ مسکین فقیہ) اس کی تمیز نہیں رکھتا کہ جو باتیں ائمہ کے اصول کی بنیاد پر ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ ان میں اور جو واقعی

كذا او على تخريج الطحاوي كذا ولا يميزون بين قولهم جواب المسئلة على قول ابي حنيفة كذا او على اصل ابي حنيفة كذا (۸۶)

ان کے اقوال ہیں۔ ان میں کیا فرق ہے وہ بیچارہ فقہ کی یہ اصلاح بھی نہیں سمجھتا جو لکھتے ہیں۔ کہ فلاں بات کرخی کی تخریج پر مبنی ہے یا طحاوی کی تخریج سے اس کا تعلق ہے

اسی طرح یہ قول کہ ابوحنیفہ کے قول پر مسئلہ کا جواب یہ ہے۔ اور ابوحنیفہ کی اصل پر جواب یہ ہے۔ ان دونوں قولوں میں ان کو کوئی تمیز نہیں ہوتی اور یہ بیچارے ان میں کوئی فرق نہیں جانتے۔

اس قسم کی واقعی تنقیدوں سے ان کی کتابیں معمور ہیں۔ ماسوا اس کے ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو

تهمنوا الطلب العلم توصلا الى العز ودر الجاه فاصبح الفقهاء بعد ما كانوا مطلوبين طالبين وبعد ان كانوا اعزة بالاعراض عن السلاطين اذلة با لاقبال عليهم (۸۷)

طالب علم کے لئے اس لئے آمادہ ہوئے تاکہ علم کو اپنی عزت اور جاہ کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں۔ نتیجہ اس کے بعد یہ ہوا کہ فقہاء جو پہلے عوام کے مطلوب تھے اب یہی عوام کے طالب ہو گئے اور سلاطین اور بادشاہوں کے دربار سے الگ رہنے کی وجہ سے جو معزز شمار کئے جاتے تھے اب بادشاہوں کے آستانوں پر وہ جھک کر ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

دین کے ان غاشیہ برداروں کو شاہ صاحب دیکھ رہے تھے۔ اور ان کا سینہ شق ہُوا جاتا تھا "ملوکی" رابطہ کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کو ان کے صحیح دین پر باقی رکھنے کی ایسوں سے کیا توقع ہو سکتی تھی پھر کچھ ہی دن پیشتر ان ہی دنیا طلب علماء کے ہاتھوں اکبر کے دربار میں اسلام کا جو منجار ہو چکا تھا۔ اس کا نقشہ بھی شاہ صاحب کے پیش نظر تھا۔

صوفیوں کی افسوسناک حالت

دوسری طرف صوفیہ اور مشائخ کی جو کیفیت تھی۔ شاہ صاحب کے دردمندوں کے لئے وہ صرف اذیت اور دُکھ ہی بنی ہوئی تھی کیونکہ علماء سے زیادہ غریب مسلمانوں پر اس زمانہ میں خصوصاً ہندوستان میں ان ہی کا اثر غالب تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ اگر مسلمان ان ہی کے ہاتھوں میں سپرد کر دئے گئے تو یہ ان کو کہاں لے جا کر غرق کریں گے اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں:۔

کرامات فروشاں ایں زماں ہمہ الاماشاء اللہ طلسمات ونیرنجات را کرامات دانستہ اند

کرامتوں کے بیچنے والے اس زمانہ میں سب کے سب ابجز اس کے جسے خدا چاہے، اپنی طلسماتی کارروائیوں اور علم نیرنج کے نتائج کو کرامات سمجھے بیٹھے ہیں۔

پھر اس کی تفصیل کرنے کے بعد کہ آدمی طلسمی قوانین اور علوم نیرنجات کے زور سے کس کس قسم کے "خوارق" دکھا سکتا ہے آخر میں فرماتے ہیں کہ

واعمال جوگ کہ بعضے ملاحظات جوگیہ را ملکیتے تمام است در اشراف وکشف

اور جوگ کی بعض تدبیریں کیونکہ جوگیوں کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو دوسرے کی حالت پر فی الجملہ اطلاع پا کشف وغیرہ سے خاص تعلق ہے۔

جن لوگوں نے شاہ صاحب کے متعلق خیال قائم کیا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے براہمہ اور جوگیہ کے فلسفہ ویدانت اور فلسفہ یوگا کو اسلامی حقائق سے مخلوط کر کے ایک "جدید ہندی دین" کی بنیاد ڈالی ہے۔ کیا ان کی نگاہوں سے یہ اور اس قسم کی بیسیوں عبارتیں نہیں گزری ہیں شاہ صاحب نے صاف کھل کر لکھ دیا ہے کہ

بسیارے از سادہ لوحاں دیدہ ایم کہ چوں ایں اعمال از شیخے فرا گرفتہ اند آں را عین کرامت مے دانند۔

میں نے بہت سے سادہ لوحوں کو دیکھا ہے کہ کسی شیخ سے جب اس قسم کے عمل وغیرہ کو سیکھ چکتے ہیں تو ان باتوں کو ٹھیک کرامت قرار دیتے ہیں

لیکن واقعہ یہ ہے کہ :۔

صلاح وفجور، مقبول بودن یا مردود بودن دریں جا ہیچ فرق پیدا نمی کند

نیکوکاری یا بدکاری اسی طرح مقبول ہونا یا مردود ہونا اس معاملہ میں اس اختلاف حال سے کوئی فرق نہیں پڑتا (یعنی ان روحانی ورزشوں سے

یہ نتائج ہر ایک میں پیدا ہوتے ہیں خواہ شقی ہو یا سعید۔

نمود والمنود کا فتنہ

خصوصاً جو زمانہ شاہ صاحب کا تھا۔ طرح طرح کے طریقے اور نئی نئی شکلوں میں تصوف پیش ہو رہا تھا۔ آپ ہی کے عہد میں ولی کا وہ مشہور مردود معروف "نمود والمنود" ایک خاص بھیس میں ان ہی طلسمی نیرنجاتی جوگیانہ طریقوں کو سیکھ کر نمودار ہوا تھا۔ جس نے ایک خاص زبان اور اس کے قواعد ایجاد کئے تھے۔ اور اپنے ایک ساتھی کو محرم اسرار بنا کر۔۔۔ "آقتہ متقدمہ"۔۔۔۔۔ نامی کتاب کے الہام کا دعویٰ کیا تھا۔ مدعی تھا کہ نبوت اور وصیت کے درمیان ایک اور لاہوتی عہدہ ہے۔ جس کی تعبیر وہ "بیگوکت" کے لفظ سے کرتا تھا کہتا تھا کہ ہر اولوالعزم پیغمبر کے ساتھ ہمیشہ نو بیگوک ہوا کئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی نو ہی بیگوک کا پیدا ہونا ضروری ہے پھر شیعوں کی جماعت میں تو یہ کہتا کہ بیگوک اوّل حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ ان کے بعد آٹھ اماموں تک یعنی حضرت علی رضا علیہ السلام تک امامت اور بیگوکت کے عہدے ایک ہی ذات میں جمع ہوتے رہے۔ ان کے بعد صرف امامت رہ گئی اور نواں آخری بیگوک کا منصب مجھے حاصل ہوا ہے۔ مجھ ہی پر یہ عہدہ ختم بھی ہو جاتا ہے اور سنیوں سے کہتا کہ چار بیگوک تو خلفاء راشدین تھے۔ اور باقی چار بیگوکوں کے لئے بنی امیہ اور بنی عباسیہ کے بعض ایسے خلفاء کا نام لیتا جو کو نہ نیکی اور دینی حیثیت میں امتیاز رکھتے تھے اور نواں بیگوک اپنے کو ٹھیراتا

اس نے عوام کو فریب دینے کے لئے اپنے مریدوں اور لڑکوں لڑکیوں کے خاص خاص مجہمل المعنی نام رکھے تھے۔ مثلاً وہی محرم اسرار جو گویا اس کا خلیفہ تھا۔ اس کا نام "دوجی یار" تھا نما نمود اور رفتار نمود دید یہ اس کے لڑکوں اور نمانہ کلاں نمانہ خورد لڑکیوں کے نام تھے۔ مریدوں کو "فرلود" کہتا تھا۔ اس نے پنج وقتہ نمازوں کے سوا "وید" نامی عبادت کا طریقہ جاری کیا تھا۔ جو طلوع وغروب واستوائے شمس کے وقت ایک خاص طریقہ سے ادا کی جاتی تھی علاوہ اسلامی عیدوں کے چند مزید تہواروں کا اضافہ کیا تھا۔ یعنی جن دنوں میں (العیاذ باللہ) اوجی کی اس پر ابتدار ہوئی۔

ملعون مدعی تھا کہ اس پر بھی وحی دو طریقوں سے آتی ہے، ایک میں آفتابی قرص اس کے سامنے نمودار ہوتا ہے اور اسی پر حرف لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور دوسری میں آواز آتی ہے۔ الغرض خرافات کا ایک سیلاب تھا جو پیر و مرید نے مل کر بہایا تھا چونکہ بعض امراء بھی اس کے معتقد ہو گئے تھے۔ اس لئے عوام کا میلان بھی اس کی طرف بتدریج بڑھتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ فرخ سیر بادشاہ بھی اس کی استجابت دعا کی شہرت سن کر تنہائی میں ملاقات کا سن کر کہ بادشاہ ملنے آرہا ہے کمرہ کا دروازہ بند کر دیا۔ ہزار منت و ماجت کے بعد جب دروازہ کھلا تو بادشاہ کے سامنے اس مرگ چھالے کو پھینک کر جس پر خود بیٹھا ہوا تھا بولا۔

پوست تخت گدائی و شاہی ہمہ داریم آنچہ می خواہی

بادشاہ اپنے ساتھ روپوں اور اشرفیوں کی تھیلیاں نذر کے لئے لے گیا۔ ٹھوکر مار کر کنارہ کر دی۔ جب فرخ سیر نے بہت اصرار کیا تو خود نوشتہ قرآن دے کر اس کی اجرت کل ستر روپیہ اس نے قبول کی۔ بادشاہ پر اس کی مصنوعی بے نیازی و استغنا کا پورا اثر ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک تو کچھ علماء اور عام پبلک کے خوف سے اپنے مزخرافات کے علانیہ اظہار کی اسے جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیکن بادشاہ کی عقیدت مندی کے بعد خوب کھل کھیلا ایک خاص قسم کی لمبی ٹوپی سر پر رکھے آگے آگے دو جھنڈوں کے ساتھ اس کے "فرلود" اس کی سواری نکالتے تھے۔ باہم ایک دوسرے پر عنبر و گلاب چھڑکتے چلتے اور وہی مجہول المعنی اختراعی الفاظ والے منتر جپتے جاتے تھے۔ اور اب ان کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ دلی کی ایک بڑی مخلوق اس کی معتقد اور اس کی اصطلاح میں اس کی "فرلود" ہو گئی تھی۔ فرخ سیر کے عہد تک اس کا یہی حال رہا۔ محمد شاہ کے زمانہ میں جب محمد امین[1] خاں منصب وزارت سے سرفراز ہوئے تو منجملہ اور کاموں کے اس "نمود و انمود" کی بھی خبر لینی چاہی لیکن اتفاق دیکھئے جیسا کہ طباطبائی نے لکھا ہے۔ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب اس کی گرفتاری کے احکام جاری ہوئے۔ امین خاں جو مرض قولنج میں پہلے ہی سے مبتلا تھے انتقال کر گئے۔ "مردود" وانمود کے لئے ان کی موت استدراج کا

---

[1] حضرت آصف جاہ اول بانی سلطنت آصفیہ کے عم زاد بھائی تھے ان کے قصے آگے بھی آ رہے ہیں۔ ۱۲

ذریعہ بن گئی۔ اب کیا تھا۔ خوب لن ترانیوں کی لینے لگا۔ اگرچہ دو تین سال بعد خود بھی مر گیا۔ اور اسی کے بعد اس کے خلیفہ اول "دوجی یار" اور صاحبزادے بلند اقبال "نمانود" میں نصف لی، نصف لک کے قصہ میں جھگڑا ہو گیا — دوجی یار نے آخر ایک دن جب اس کے اکثر "فرلودون" کا مجمع تھا کھڑے ہو کر "سازش" کا سارا قصہ سنا دیا۔ دونوں مل کر جو مسودات بناتے اور کاٹ پیٹ کر درست کرتے تھے ان کا طومار لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اور کہا کہ اگر

از جانب خدا می بود حاجت	اگر اللہ میاں کی طرف سے یہ کتاب
بحک اصلاح ہمہ گر نداشت	ہوتی تو اس میں کاٹ چھانٹ اور
	اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی۔

دلوں کے حروف کے پہچاننے والے کثرت سے موجود تھے۔ راز کھل گیا۔ اور بیچارے عوام کو اس کے فتنہ سے نجات میسر آئی۔ اگرچہ "نمانود" نے کچھ دن اپنے باپ کی بگوکت کو بجائے دہلی کے ایک دیہات میں جا کر چلایا اور "نمانود" کے بعد "فغار" صاحب دوسرے بیٹے نے بھی کچھ دن اس تحریک کو چند لوگوں میں باقی رکھا۔ یہاں تک کہ بالآخر "فغار" کے مرنے کے بعد چند بقیۃ السیف اس کے اعزہ بنگال میں پناہ گزین ہوئے اور مشہور اشقی القوم میر جعفر کے بیٹے میرن کی سرپرستی میں کچھ دن گزارے۔ خدا جانے ان منحوسوں کے نام لیوا اب بھی بنگال میں پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ تاہم ایک مدت تک خصوصاً اس زمانہ میں جس میں حضرت

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دلّی میں تھے۔ ہندوستان کے مسلمان اس خبیث فتنہ کے شکار ہو رہے تھے۔ اور واقعہ کچھ بھی نہ تھا۔ عالمگیر کے عہد میں کابل کا صوبہ دار امیر خاں تھا۔ اس کے پاس ایران سے یہی "نمود و انمود" جس کا اصلی نام محمد حسین تھا، آیا اور سیّد ہونے کا مدعی ہُوا۔ امیر خاں کی بیوی جو لاولد تھی اس نے ایک لڑکی پال رکھی تھی اسی سے اس کا نکاح ہو گیا امیری سے گزرنے لگی۔ امیر خاں جب مر گیا تو محمد حسین جو امیر خاں کے خوشبو خانہ کا داروغہ بھی تھا عطر و گلاب کا تحفہ لے کر دلّی چلا۔ لاہور میں عالمگیر کی وفات اور خانہ جنگی کی خبر ملی امراء کے ہاتھ اسی عطر و گلاب کو بیچ کر اس نے ساٹھ ستّر ہزار روپے کھرے کئے اور اسی نے "دوجی" یار سے سازش کر کے مکر و فریب کا یہ طلسم کھڑا کیا تھا[1]۔

مسلمانوں کی یہ زود اعتقادیاں جو غلط تصوّف کے رواج کا نتیجہ تھیں حتیٰ کہ بادشاہ تک ان ہی اوہام میں مبتلا تھا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک صاحب بصیرت روح کے لئے کس درجہ سوہان روح بنی ہوئی ہوں گی اور بات کچھ اسی پر ختم نہیں ہو گئی تھی۔ یہ تو ایک فرقہ تھا اور بھی اس قسم

---

[1] میں نے اس مردود "نمود و انمود" کے حالات میں ذرا زیادہ بسط سے قصداً کام لیا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس زمانہ میں بھی بعض لوگ اپنے مریدوں اور عزیزوں کو عجیب و غریب خطابات تقسیم فرماتے ہیں یا نبوت و مسیحیت مہدویت وغیرہ کے معجون سے بروزی "مثالی" اور خدا جانے کس کس قسم کی نبوتیں تراش رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہندوستان ان تماشوں کو پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ ۱۲۔

کے مختلف فرقے مختلف ناموں سے تصوف وعرفان کے بلند آہنگ دعوؤں کے ساتھ پیدا ہو رہے تھے اور مختلف شعبدوں اکرشموں سے عوام کو اپنی طرف مائل کرکے گمراہ کر رہے تھے۔ شاہ صاحب خود اپنا ذاتی تجربہ بیان فرماتے ہیں:-

نجوم کے شعبدے اور کہانت کے کرشمے

ما تجربہ کردہ ایم کہ ماہر در فن نجوم چوں دانست الحال کدام دقیقہ است از دقائق روز ازیں جا ذہن او منتقل مے شود بطالع وہم بیوت و مواضع کواکب در خاطر حل صورت مے بندد گویا صفحۂ تسویۃ البیوت مقابل او ایستادہ است وہم چنیں ماہر در فن رمل گاہے در دل خود معین مے کند کہ فلاں انگشت را لحیان قرار دادہ ام و فلاں انگشت را فلاں شکل در ذہن صورت مے بندد ازیں اشکال کدام متولد می شود

میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ نجوم کے فن میں جن لوگوں کو مہارت ہوتی ہے۔ جب انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت دن کے دقیقوں میں سے کون دقیقہ ہے تو مطالع تو مطالع ہر ہر بیت و مقامات کواکب کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے اور یہی حال ان لوگوں کا ہے جو فن رمل میں ماہر ہوتے ہیں اپنے دل میں یہ خیال جماتے ہیں کہ فلاں انگلی کو میں نے لحیان قرار دیا ہے اور فلاں انگلی کو فلاں شکل اور ان سب سے ذہن میں ایک صورت قائم کرکے سوچتے ہیں کہ ان میں ظاہری شکل و صورت میں بچہ

تا اینکہ زائچہ پیش او حاضر شود۔	کس کے مناسب ہوگا۔ اس طرح زائچہ سامنے ہو جاتا ہے۔

اور یہ نجوم کا حال ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ کہانت جس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں کبھی جنّ اور ارواح کو حاضر کیا جاتا ہے (یعنی موجودہ زمانہ کا اس پیرولیوچزم) نیز توجہ کو کسی نقطہ پر مرکوز کر کے معمول کو متاثر کرنا جسے اب مسمریزم کہتے ہیں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

ہمت بستن برکارے وشکل مہیب برآمدن و دل بر دل کسے داشتن وطالب را مسخر کردن ہمہ از فنون نیرنج است ۔	کسی کام کے متعلق ہمت کو قوی کرنا اور ڈراؤنی شکل میں لوگوں کے سامنے اپنے کو نمایاں کرنا کسی کے دل پر دل رکھنا اور طالب کو مسخر کرنا یہ ساری باتیں علم نیرنگ سے تعلق رکھتی ہیں۔
(وصیت نامہ صد۲۲)	

لیکن غلط تصوّف نے عوام کو باور کرایا تھا کہ یہ ساری باتیں قرب الٰہی کے دلائل ہیں۔

اس زمانہ کا "ہیپناٹزم" جس میں اپنے اوپر وجد کی حالت طاری کر کے غیبی باتیں بتائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ اس راہ سے بھی شکار پھنسا رہے تھے۔ حضرت شاہ صاحب ہی کا بیان ہے:۔

ہم چنیں وجد و ذوق و قلق سرایت ایں حالت در حاضرآں	اسی طرح وجد و شوق و بےچینی اور جو لوگ موجود ہوں ان میں اس

حال کا ساری وطاری ہو جانا۔

حالانکہ اس حال کو بھی مقبولیت حق سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ بقول حضرت

منشا آں حدت قوت بہیمیہ است۔	اس کا منشا بہیمی قوت کی شدت اور تیزی ہے۔

اور یہ تو زندہ پیروں کی کرامات شمار ہوتے تھے۔ وہمی تخیلات نے گزشتہ روحوں کے متعلق عجیب وغریب خیالات پیدا کر دئیے تھے۔ فاتحہ جو عموماً اس لئے کیا جاتا ہے کہ بزرگوں کی روح کو کچھ قرآن پڑھ کر اور غرباؤ مساکین کو کھلا کر اس کا ثواب بخشا جائے۔ لیکن سرزمین ہند میں اس فاتحہ نے بتدریج ایصال ثواب کے مقصد کو چھوڑتے ہوئے قریب قریب وہی شکل اختیار کر لی تھی جو ہندوؤں میں چڑھاوے کی ہے یعنی مختلف قسم کے پھل پھول پکوان وغیرہ دیوتاؤں اور دیویوں پر اس لئے چڑھائے جاتے ہیں کہ ان دیوتاؤں کی روحیں چڑھانیوالوں کے اس تحفہ سے خود متمتع اور لذت گیر ہوتی ہیں۔ جاہل مسلمانوں میں اس فاتحہ کا بھی قریب قریب یہی مطلب ہو گیا تھا اور عوام ہی کیا بعض خواص تک کا یہ خیال تھا کہ جو کھانا کسی بزرگ کے نام فاتحہ دیا جاتا ہے اس پر اس بزرگ کی روح خود حاضر ہوتی ہے اور ان سے لذت گیر ہوتی ہے مولوی غلام حسین طبا طبائی جنہوں نے سیر المتاخرین جیسی کتاب لکھی ہے اور جو ان کے علم وفضل کی کھلی دلیل ہے خود اپنے متعلق ایک موقعہ پر

اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:۔

بعضے مردم کہ دسترخوان حضرت شاہ مرداں می نمائند وبراں نشانے از غیب مے شود۔ چنانچہ در ہند معمولی و مکرر مردم ہوشیار بچشم خود نشانہا را دیدۂ سرمہ اعتقاد بصیرت در دیدۂ دلہا کشیدہ اند وایں کرامت ازاں جناب بنظر احقر ہم الحمد للہ مکرر در آمدہ۔ صفحہ ۲۶

بعض لوگ جو حضرت شاہ مرداں (یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ) کے دسترخوان کی تقریب کرتے ہیں تو اس دسترخوان پر غیب سے آپ ہی آپ ایک نشان نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں اس کا رواج ہے اور بڑے اچھے ہوش گوش والوں نے بار بار اپنی آنکھوں سے ان نشانوں کو دیکھا اور اپنی آنکھوں میں اعتقاد و بصیرت کا سرمہ لگایا۔ بلکہ (دسترخوان والی کرامت حضرت کی) اس کا معائنہ تو الحمد للہ متعدد بار اس احقر کو بھی ہوا ہے۔

جس کے معنے بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام سے جو فاتحہ دی جاتی تھی اس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ فاتحہ کے اس کھانے پر خود حضرت تشریف فرما ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے "قبولیت" کی علامت اس پر بنا دیتے ہیں بتایا جائے کہ کہاں فاتحہ کا وہ مقصد کہ بزرگوں کی روح کو اس کا ثواب بخشا جاتا، اور کہاں یہ اعتقاد کہ اس کھانے پر ان بزرگوں کی روح خود حاضر ہوتی ہے۔ یہ نشانات کس طرح بنتے تھے۔ اس سے تو خدا ہی واقف ہے

لیکن طبا طبائی صاحب ہی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے جو ان کے نزدیک خارجی العقیدہ تھا شیعوں کے علی الرغم ان غیبی نشانوں کی خبر سن کر دعویٰ کیا کہ ہم بھی یزید وغیرہ کے نام کا فاتحہ دیتے ہیں اور اسی قسم کے دسترخوان کا انتظام کرتے ہیں چونکہ ان کی روحوں سے مجھے اخلاص ہے اس لئے وہ بھی ضرور آکر دسترخوان پر نشان بنائیں گے یہ ارادہ کرکے اس نے دسترخوان کا انتظام کیا اور ایک عورت کو حکم دیا کہ کمرہ میں دسترخوان کو بند کرکے باہر اس کی کنجی لے کر بیٹھ جائے۔ اور تھوڑی دیر بعد دروازہ کھولے اور جب نشانات دسترخوان پر نمایاں ہوں تو مجھے خبر دے تاکہ دوسروں کو بھی اس کا تماشہ دکھایا جائے۔

اب طبا طبائی صاحب لکھتے ہیں کہ

زن در باطن شیعہ بود و مذہب	وہ عورت اندر سے شیعہ مذہب
خود مخفی داشت بعد از ساعتے	اور تقیہ کئے ہوئے تھی تھوڑی دیر
حسب الامر در را کشود دید کہ سگے	بعد اس نے جب دروازہ کھولا تو
سیاہ گرگین دراں جا بیٹھا بر سر دسترخوان	کیا دیکھتی ہے کہ ایک کالا بھیڑئے
نشستہ از ہر گونہ طعام اندک	جیسا کتا وہاں دسترخوان پر ہر قسم
اندک چشیدہ و می چشد از	کے کھانے کو تھوڑا تھوڑا چکھ چکا
شدت شغف خود داری نتوانست	اور چکھ رہا ہے۔ عورت کا پتے
بے اختیار دوید و بشارت رسانید	مذہب سے جو محبت تھی۔ اس نے
کہ نشان چہ معنی دارد خود تشریف	اپنی خود داری پر اس کو باقی نہ رکھا

آوردہ نوش جان می نمایند — اور بے اختیار ہو کر دوڑی۔ امیر کو اس نے بشارت پہنچائی کہ نشان

کا کیا پوچھتے ہیں وہ تو خود ہی تشریف لاکر نوش جان فرما رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ حرکت "زن در باطن شیعہ بود" ہی کی تھی۔ بس اسی واقعہ سے ان نشانوں کے بنانے والوں کا سراغ مل سکتا ہے آج بھی ہندوؤں میں جب مردے گنگا میں بہلنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ تو ان کے بہنے کے بعد دوسرے دن عموماً پنڈت یہ اعلان کرتے ہیں کہ جس گھاٹ سے مردہ بہایا گیا اس کے کنارے کی ریت پر فلاں جانور کے پاؤں کے نشانات دیکھے گئے اور اسی سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ مرنے والے نے اسی جانور کے جون میں جنم لیا جس کے نشانات نظر آئے ہیں۔ مجھ سے بعض معتبر برہمنوں نے بیان کیا کہ یہ کارستانی خود ان پنڈتوں کی ہوتی ہے کہ جو گنگا کے کنارے مردوں کے بہانے کی رسم انجام دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے یا ممکن ہے کہ رات کو ہر قسم کے جانور چلتے ہیں ان ہی کو مردے کے قدم کا نشان فرض کر لیا جاتا ہے یا وہم کی خلاقی ہو۔ بہرحال ملیا طبائی صاحب نے "کتے" کا جو واقعہ نقل کیا ہے اور یہ کہ ہر قسم کے کھانوں کو "اندک اندک" تُسے چکھتے پایا گیا اس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ صاحب فاتحہ کے متعلق لوگوں کا عام خیال یہی تھا کہ تھوڑا تھوڑا ہر کھانے سے مردہ کی روح چکھتی ہے۔ گو بحمد اللہ اب بہت کم لوگ فاتحہ کے متعلق

یہ خیال رکھتے ہیں اور عموماً اب یہی سمجھا جاتا ہے کہ مقصود بزرگوں کی روح کو ثواب پہنچانا ہے لیکن بعض لوگ اب بھی ایسے ہیں جنہوں نے مجھ سے خود کہا ہے کہ "کھانے کی روح کو بزرگوں کی روح آکر کھا جاتی ہے اور اس کے مادی وجود کو ہم لوگ کھاتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ہم اس کھانے کو بزرگوں کا اُلش خیال کرتے ہیں"۔ الغرض غلط "تصوف" اور جھوٹے "تشیع" کی راہوں سے اعتقادی و عملی تباہیوں کا سیلاب مختلف شکلوں میں ملک کے مختلف گوشوں میں مسلمانوں کی خالص اسلامی مذہبی زندگی کے "ایوان" کو دھمکیاں دے رہا تھا۔

م الفتن یعنی خانہ جنگی

اور سچ پوچھئے تو باہر کے فتنوں کے جگانے میں دراصل جو حقیقی اسباب کام کر رہے تھے۔ ان کا باہر سے نہیں بلکہ بالکلیہ تعلق ہمارے "اندر" ہی سے تھا۔ کچھ آج نہیں بلکہ جب کبھی جہاں کہیں یہ صورت پیش آئی ہے تحلیل و تجزیہ کے بعد یہی ثابت ہوا کہ جو کچھ ہوا۔

ماظلمناھم ولکن کانوا انفسہم یظلمون — نہیں ظلم کیا ہم نے بلکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔ کہ ازلی قانون ہی کے تحت ہوا۔ خصوصاً امت محمدیہ علی اللہ علی صاحبہا صلوٰۃ وسلاماً کے متعلق تو صحیح حدیثوں میں آچکا تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہِ الٰہی میں درخواست پیش کی۔

لا تسلط علیہم عدواً — (میری امت پر) ان ہی میں سے

من انفسھم — ان پر کوئی دشمن نہ مسلط کیا جائے۔

تو "الحکیم الغنی" کی طرف سے آپ کو جواب ملا۔

"میں ان پر ان کے سوا کسی (بیرونی دشمن) کو مسلط نہیں کروں گا۔

لا اسلط علیھم عدوا سوی انفسھم یستباح بیضتھم ولو اجتمع علیھم من باقطارھا حتیٰ یکون بعضھم یہلک بعضھا۔ — بلکہ وہی اندرونی دشمن ان کے قلمرو میں تباہی پھیلائے گا۔ اور خارجی دشمن مسلمانوں پر مسلط نہیں ہو سکتے اگرچہ زمین کے کناروں سے سمٹ کر کیوں نہ وہ آجائیں بلکہ مسلمان ہی باہم بعض بعض کو ہلاک کریں گے۔

صحاح کی مختلف کتابوں مثلاً ابوداؤد ترمذی میں الفاظ کی کچھ کمی بیشی کے ساتھ یہ حدیث موجود ہے اور اسلام کی تاریخ مشاہد ہے جو مصیبت مسلمانوں پر جس شکل میں بھی آئی درا صل اس کی ابتداء گھر والوں سے ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے۔

اخشیٰ علیکم الدنیا فتنا فسوا فیھا (بخاری) — میں تم پر دنیا سے ڈرتا ہوں۔ کہ اس کے معاملہ میں باہم نفسانیت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جب فارس کے اموال غنیمت آئے۔ آپ نے ان کو مسجد نبوی کے چبوتروں پر ڈلوا دیا۔ صبح ہوئی تو جو

کچھ آیا تھا اس پر سے چادر ہٹائی گئی۔ راوی کا بیان ہے:۔

فنظر عمر الی شی لم تر عیناہ مثلہ من الجوھر واللولؤ والذھب والفضۃ فبکی۔	عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسی چیزیں دیکھیں جنہیں ان کی آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا یعنی جواہرات موتی اور سونے چاندی وغیرہ پس عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو پڑے۔

عبدالرحمٰن بن عوف حاضر تھے۔ بولے:۔

ھذا من مواقف الشکر فما یبکیک۔	یہ تو شکر کی جگہ ہے پھر آپ کو کس خیال نے رلایا۔

فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا:۔

اجل ولکن اللہ لم یعط قوما ھذا الا القی بینھم العداوۃ والبغضاء۔ (کتاب الخراج لابی یوسف)	ہاں! لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو یہ چیز نہیں دی۔ مگر اسی کے ساتھ ان میں باہم عداوت و بغض و کینہ پیدا ہو گیا۔

مغل حکومت بھی عہد عالمگیری کے بعد فتنوں کے جس طوفان میں گھر گئی تھی۔ جس کا ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا جاننے والے جانتے ہیں کہ باہر سے جتنے سیلاب آئے ان کا سرچشمہ بھی اندر ہی تھا۔ جس کا افسانہ طویل ہے اور عام طور سے تاریخ کی کتابوں میں مسطور ہے۔ میرا اشارہ اس اندرونی فتنہ کی طرف ہے جس کی

تعبیر عام کتابوں میں "سادات بارہ"[1] کے فتنہ سے کی جاتی ہے۔

سادات بارہ کا فتنہ عالمگیر کے لڑکے بہادر شاہ کے انتقال کے بعد معزالدین جہاندار شاہ اور فرخ سیر میں جنگ ہوئی اس معرکہ میں فرخ سیر کی کامیابی چونکہ بالکلیہ بارہ کے سیّدوں میں سے دو بھائی حسین علی خاں اور حسن علی خاں کی رہین منّت تھی اسی بنا پر فرخ سیر کے عہد میں حکومت پر ان ہی دو بھائیوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اور ایسا اقتدار کہ بادشاہ بیچارہ "شاہ شطرنج" ہو کر رہ گیا۔ قدرتاً فرخ سیر کے لئے یہ صورت ناقابلِ برداشت بنتی چلی جا رہی تھی۔ سید بھائیوں اور فرخ سیر میں اَن بن ہو گئی اور اسی مخالفت اور معاندت نے بالآخر ان

[1] کہا جاتا ہے کہ سید ابو الفرح واسطی اکبر کے عہد سے پہلے عراق کے مشہور شہر واسط سے ہندوستان تشریف لائے۔ ابتدا میں پٹیالہ (پنجاب) کے گرد و نواح میں آپ کی اولاد آباد ہوئی جن گاؤں میں ان کی اولاد آباد ہوئی تھی ان کے نام چھت بانوڑ، تھن پور اور جگت نیر تھے۔ پھر سادات کا یہ خاندان آگے بڑھا دوآبہ میں آباد ہوا ضلع مظفرنگر میں جانسٹھ اب بھی ایک مشہور قصبہ ہے اس میں اس خاندان کے کچھ لوگ آباد ہوئے اور یہی سادات بارہ کے نام سے مشہور رہے یہ بارہ کیوں کہلاتے ہیں؟ مورخین اس کی توجیہہ میں مختلف ہیں لیکن ابو الفرح واسطی کی جو اولاد جگت نیر میں آباد ہوئی تھی اور بعد کو وہ جاجنیری سادات کے نام سے مشہور ہوئی ان کا ایک سلسلہ بہار ضلع مونگیر میں پایا جاتا ہے اور چونکہ بارہ گاؤں میں یہ آباد ہیں اس لئے سادات بارہ گانواں کہلاتے ہیں۔ خاکسار مناظر احسن گیلانی کا تعلق بھی ان ہی جاجنیری سادات سے ہے بارہ کی وجہ یہاں بھی ممکن ہے بارہ گاؤں سے ہو۔ ۱۲

نتائج کو پیدا کیا جن کا خمیازہ آج ہندوستان کے مسلمان بھگت رہے ہیں۔ طبا طبائی جو ہم مشربی کی وجہ سے بجائے فرخ سیر کے سید بھائیوں کے سخت ترین طرفدار وں میں ہیں۔ ان کو لکھنا پڑا کہ یہی فضاحات سادات

بمرور تمام مملکت ہندوستان را فرو گرفتہ اقتدار سلاطین تیموریہ بالمرہ بباد فنا رفت۔	آہستہ آہستہ ہندوستان کی ساری مملکت کا اس نے احاطہ کر لیا۔ اور تیموری سلاطین کا اقتدار قطعی طور سے فنا کی آندھی کے نذر ہو گیا۔

اس فتنہ کی اصل جڑ شیعہ سنّی اختلاف تھا

اگرچہ بظاہر یہ مخالفت بادشاہ اور ان سید برادران کے درمیان تھی لیکن جو واقعات کے عالم ہیں وہ جانتے ہیں کہ "سادات بارہ" کے اقتدار نے دراصل اسی فتنہ کی آگ کو ہوا دے کر تیز کر دیا جس کی ابتداءً ہمایوں کے عہد سے اس ملک میں شروع ہوئی تھی ——— سب جانتے ہیں کہ یہاں اسلام کا داخلہ (عربی حملوں کے بعد) ترکستانی مسلمانوں کے ذریعے سے ہوا۔

اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ غوریوں سے لودیوں تک جتنے خانوادے دلی کے تخت پر قابض ہوئے سب کے سب سنی حنفی مسلمان تھے۔ جب تک یہ دور رہا ہندوستانی مسلمان اس وقت تک سارے خوش قسمت رہے۔

ہندوستان میں شیعیت کے قدم

لیکن مغلی عہد میں ہمایوں کو شیر شاہی حکومت کے مقابلہ میں

جب ایرانی حکومت کی امداد سے کامیابی حاصل ہوئی تو اس ملک میں تورانیوں کے ساتھ ایرانیوں کا اقتدار بھی بڑھنے لگا۔ ہمایوں اور ہمایوں کے بعد جتنے مغل بادشاہ تھے وہ بطور منت شناسی کے ایران سے آنے والوں کو بڑی قدر و عزت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لینے لگے اور اسی زمانہ سے بڑے بڑے عہدوں پر حتیٰ کہ صوبہ داریوں اور گورنریوں پر بھی ایرانی حکام کا تقرر ہونے لگا۔ عالمگیر کے عہد تک مغل حکومت شباب کے دور میں تھی جو زہر اندر داخل ہو گیا تھا اس کے نتائج محسوس نہیں ہوتے تھے۔ لیکن عالمگیر کے بعد عناصر کے اعتدال میں ضعف پیدا ہوا اور ان دو متضاد عناصر کے اندرونی تصادم نے رنگ لانا شروع کیا۔ سادات بارہ اگرچہ وطناً ایرانی نہ تھے۔ لیکن ان کا مسلک وہی تھا جو ایرانیوں کا تھا۔ قدرتی طور پر ان کے زمانۂ اقتدار میں ایرانی امراء کو تورانی یا دوسرے لفظوں میں سنی امراء پر برتری حاصل ہونے لگی اور اتنی برتری کہ بعض بڑے بڑے تورانی امیر تو حکومت اور حکومت کے تعلقات سے دست کش ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ جن میں حضرت آصف جاہ اول بانی حکومت آصفیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں :-

کہ بنا بر گرمی بازار امراء جدید و	نئے امیروں کی گرم بازاری اور پرانے
کساد بازاری امراء قدیم از نوکری	قدیم امراء کی کساد بازاری کو دیکھ کر
استعفا دادہ بہ دار الخلافہ	حضرت آصف جاہ اول مغل حکومت
شاہجہان آباد آمدہ و لباس	کی ملازمت سے مستعفی ہو کر شاہجہان آباد

درویشانہ پوشیدہ خانہ نشین شد۔ (ص۱۲)	پہنچے اور درویشانہ لباس اختیار کر کے خانہ نشین ہو گئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سارے فتنوں کی بنیاد اگر سچ پوچھئے تو ہندوستان میں بھی وہی مسئلہ رہا جس سے ہر جگہ حتیٰ کہ پہلی صدی ہجری میں فتنوں کی ابتداء ہوئی یعنی وہی شیعیت و سنیت کا جھگڑا، ابتدا تاریخ اسلام سے جس کسی کے دل میں دنیا طلبی کی انگیٹھی سلگی اس نے دین کے اسی مسئلہ کی آڑ لے کر اپنے حرص و ہوا کی جہنم روشن کی اور آج تک یہ حال ہے کہ جس واقعہ پر اس اختلاف کی بنیاد قائم ہے۔ حالانکہ اس پر تیرہ سو سال گزر چکے، لیکن جب کسی کا جی چاہتا ہے۔ اس کو تر و تازہ کر کے اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ واقعہ اسی وقت پیش آ رہا ہے۔ اور فریقین کو دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو ابھی طے کرنا ہے۔

اسلامی عقائد کے متعلق ایک عام غلط فہمی

کتنی عجیب بات ہے کہ قرآنی تعلیمات کے بیشمار بینات و محکمات مثلاً یہ کہ کسی مومن کے لئے قطعاً یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے کو کسی حال میں اکیلا و تنہا خیال کرے۔ اس پر یہ اعتقاد حتمی طور پر واجب ہے کہ ہر حالت میں ایک لامحدود قوت کو انتہائی رحم و کرم کے ساتھ اپنے قریب یقین کرے محسوس کرے کہ یہ قوت اس کے ظاہر و باطن، اول و آخر کو محیط ہے۔ بغیر کسی دغدغہ کے اس واقعہ پر بھروسہ کرے

کہ اس کی ایمانی صفت کی وجہ سے یہی لا محدود طاقت ہر لمحہ اور ہر حال میں
اس کی طرف سے مدافعت پر آمادہ ہے۔ جب مومن مخلوقات کی لہیت
پر قدم جماتا ہے۔ تو اس کو باور کرنا چاہیئے اور قطعاً بغیر کسی شک و شبہ
کے باور کرنا چاہیئے کہ غیبی قوتیں یعنی ملائکۃ اللہ اس پر نازل ہوتے
ہیں اور دنیا و آخرت میں اس کی امداد و اعانت ان کے فرائض میں سے
ہے علی ہذا۔ مثلاً ہر مومن کا فرض ہے کہ اپنے ماں باپ' اموال و تجارت'
گھر در الغرض ہر چیز سے زیادہ اپنے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے
محبت رکھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اور ایسی بیسوں باتیں ہیں جو قرآن کے
نصوص صریحہ سے بغیر کسی تاویل کے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح حمد و شکر
توکل و تفویض' توبہ استغفار' انابت و اطاعت وغیرہ وغیرہ ان کے
قرآنی حقائق ہونے میں کون شک کرسکتا ہے بلاشبہ یہ ساری چیزیں
ایسی ہیں کہ ان کا انکار کرنے والا کافر ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان
ہی چیزوں کا نام عقائد ہے۔ لیکن بجائے ان کے ایسی باتیں کہ خدا کے
صفات زائد بر ذات ہیں یا عین ذات' صفات حقیقی سات ہیں یا آٹھ
پھر ہر صفت کی نوعیت کیا ہے۔ خصوصاً کلام کی قسمیں اور اس کے
مباحث از یں قبیل یہ مسئلہ کہ دنیائے اسلام کے کس علاقہ کے کن
باشندوں کو اور ان باشندوں میں کس قبیلہ کو اس قبیلہ میں سے کس
بطن کو اس بطن سے کس فخذ کو اس فخذ سے کس گھرانے والوں کو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور خلافت کا صرف استحقاق

نہیں بلکہ پہلا استحقاق حاصل ہے۔ ان مسائل کو عقائد کی کتابوں میں مجبوراً اس لئے شریک کرنا پڑا۔ کہ مختلف لوگوں نے مختلف زبانوں میں ان ہی مسائل کو اپنے فساد و زیغ کا ذریعہ بنایا۔ اگر بنی امیہ خلافت کے مباحث کا سب وشتم کے ساتھ برسر منبر فیصلہ کرنے کی ابتداء نہ کرتے تو جو واقعہ ہو چکا تھا اور جن لوگوں کا اس سے تعلق تھا جب وہ گزر چکے تھے پھر ان کو کوئی خواہ مخواہ کیوں چھیڑتا۔ لیکن چھیڑنے والوں نے ان ہی چیزوں کو زیادہ اجاگر کرکے اسلام کی طرف منسوب کرنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتابوں میں آخر ان ہی مباحث کی طرف زیادہ توجہ کرنی پڑی اور قرآن کے سینکڑوں بینات و محکمات نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اور ایسے اوجھل کہ بجائے اعتقادیات میں شریک کرنے کے سمجھا جاتا ہے کہ اچھے مسلمان ہونے یا دوسرے لفظوں میں صوفی مسلمان ہونے کے لئے ان کی مشق و مزاولت ایک پیشہ کی حیثیت رکھتی ہے اور بس ـــــــــ حالانکہ ان میں ہر مسئلہ قرآن کا تھا۔ جس کا انکار آدمی کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ عقائد کی کتابوں میں جن چیزوں کو عقائد کے ذیل میں علماء نے شریک فرمایا ہے میں ان کو اعتقادیات قرار دینے سے انکار کر رہا ہوں۔ بلکہ مجھے کہنا یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف اغراض سے لوگوں نے بعض خاص چیزوں پر جو زور دے دیا تو اس کا آج یہ نتیجہ ہے کہ بہت سے اعتقادی امور ان کتابوں میں

شریک نہ ہو سکے جو اسی لئے لکھی گئی ہیں کہ ہر مسلمان کا اس کے ہر مسئلہ پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔ لوگوں کو غلط فہمی یہ ہو گئی کہ جو کچھ ان کتابوں میں نہیں گویا وہ اعتقادیات سے تعلق ہی نہیں رکھتا۔ حالانکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ واقعہ نہیں ہے۔ کم از کم قرآن کی ہر تعلیم کی حیثیت تو یہی ہے کہ اس کا انکار کفر ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ توکل کے سلسلہ کی چیز ہو یا تسلیم و رضا و صبر و شکر کے باب کی ہو۔

شہزادہ فرخ سیر کا بیدردانہ قتل

میں اپنے مقصد سے بہت زیادہ دور ہٹتا چلا جا رہا ہوں۔ کہہ یہ رہا تھا کہ بالآخر سادات بارہ کے زمانہ میں پھر اسی پرانے مسئلہ نے ہندوستان میں سر اٹھایا اور بالآخر اس کا انجام اس پر ہوا کہ ان ہی بادشاہ گیر سید بھائیوں کے ہاتھ فرخ سیر مقتول ہوا۔ اور انتہائی بے دردی و شقاوت قلبی میں اس کی گردن کھینچ دی گئی۔ حضرت آصف جاہ اول کے استاد مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی نے تاریخ لکھی :-

دیدی کہ چہ با د شاہ گرامی کردند | صد جور و جفا از رہ خامی کردند
تاریخ چو از خرد بجستم فرمود | سادات بوئے نمک حرامی کردند

مغل بادشاہ کا ارباب حکومت کے ہاتھ سے مارا جانا غالباً یہ پہلا واقعہ تھا۔ جو دلی میں پیش آیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت جوان ہو چکے تھے۔

شاہ عبدالرحیم کا ایک عجیب خواب

"انفاس العارفین" میں آپ نے

فرخ سیئر اور سید بھائیوں کے اس تنازعہ کا ذکر فرمایا ہے اور ایک خاص بات یہ لکھی ہے کہ آپ کے والد شاہ عبدالرحیم کی خدمت میں اس جھگڑے کے قصے جب پیش ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا :۔

در واقعہ دیدم کہ گویا مسند فرخ سیر را مردم می خواہند کہ برہم زنند	میں نے (کشفی) واقعہ میں دیکھا کہ فرخ سیر کی مسند کو لوگ الٹ دینا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ نے جو واقعہ نقل فرمایا ہے "عقل دنیا" اس کے ماننے کے لئے شاید تیار نہ ہو۔ لیکن جیسا کہ ابدالی اور مرہٹہ کی جنگ کا غیب میں کسی اور سے تعلق تھا۔ فرخ سیئر کا ایک زمانہ تک سید بھائیوں کے حملہ سے محفوظ رہنا اس میں جس کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ وہ شاہ ولی اللہ کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں کہ میرے والد نے اُن لوگوں سے جو بادشاہ کی مسند الٹنا چاہتے تھے فرمایا۔ کہ

برائے من ایں را ہم چنیں بگزارید۔ (صہ ۶۲)	میری خاطر اس بادشاہ (فرخ سیر) کو اسی حال میں چھوڑ دو (یعنی اس پر ظلم و زیادتی نہ کرو)

شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ جب تک ان کے والد زندہ رہے فرخ سیئر پہ آنچ نہ آنے پائی۔ لیکن جونہی ان کا انتقال ہوا۔ کُل

بعد پنجاہ روز از وفات حضرت ایشاں اسیر شد۔	پچاس دن آپ کی وفات کے بعد فرخ سیئر قید ہو گیا۔

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اور تاریخوں میں اس کی تفصیل لکھی ہوئی ہے کہ فرخ سیر کا ان بھائیوں کے ہاتھ سے قتل ہونا تھا۔ کہ ملک میں ایک ایسا زلزلہ برپا ہوا کہ پھر نہ تھما۔ شاہ ولی اللہ اپنی چشم دید شہادت یہ درج فرماتے ہیں ۔

ہرج و مرج عظیم دست داد سخت کشت و خون کی گرم بازاری ہوئی۔

خصوصاً تورانی امراء اپنے ہم مذہب بادشاہ کے اس دردناک مظلومانہ قتل سے سخت برہم ہوئے۔ جیسا کہ میں نے لکھا تھا حضرت آصف جاہ رحمتہ اللہ علیہ نے ترک دنیا کر کے اسی "جنون ترک منصبہا" کو اختیار فرما لیا تھا جو شاہ ولی اللہ کا مسلک تھا۔ لیکن اس واقعہ نے ان کی رگ حمیت میں جوش پیدا کر دیا اور لباس فقیری اتار میدان میں اتر آئے سادات بارہ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کو رام کر لیا جائے لیکن دلی چھوڑ کر وہ مالوہ اور دکن کے جنگلوں میں جوش انتقام میں بھرے ہوئے شیر ژیاں کی طرح ڈکارتے پھرتے تھے۔ مظلوم بادشاہ کی تڑپتی ہوئی لاش ان کو چین لینے نہیں دیتی تھی۔ مشہور ہے کہ حسین علی خاں نے ایک خط بڑی منت سماجت کا ان کو مالوہ لکھا۔ جواب میں صرف یہ شعر لکھ کر حضرت آصف جاہ نے بھیج دیا ؎

من بے وفا نیم بو فائے خورم قسم
من چو شما نیم بشما ئے خورم قسم

رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کی تخت نشینی اور چند ہی روز میں ان کے انتقال کے بعد محمد شاہ کا دور دورہ

بہرحال فرخ سیر کو ختم کر کے ان بھائیوں نے پہلے رفیع الدرجات پھر رفیع الدولہ کو دلی کے تخت پر اپنے نوکر ہونے کی حیثیت سے تخت نشین کیا۔ چونکہ دونوں مدقوق تھے۔ تین چار مہینے کے اندر اندر دونوں کا خاتمہ ہوگیا۔ تب سید برادران نے محمد شاہ بادشاہ کو اپنا نوکر بنا کر مغل تخت پر بٹھایا۔ اور اسی کو حسین علی خاں اپنے ساتھ لے کر تورانیوں کے سردار آصف جاہ کو ختم کرنے کے لئے ایک فوج لے کر دکن کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں آصف جاہ نے قبضہ جما لیا تھا۔ مگر چند ہی منزل دلی سے آگے بڑھے تھے کہ آخر جس شاہین بلند آشیانہ کے شکار کے لئے نکلے تھے اس کی دعاہائے نیم شبی کہئے یا دعا کے ساتھ اس کی دولت کے بھی شکار ہو گئے۔ حضرت آصف جاہ کے چچا زاد بھائی محمد امین خاں کے اشارہ سے میر حیدر کاشغری نے حسین علی خاں کا کام تمام کر دیا۔ سفر میں جب حسین علی خاں کی بارگاہ لوٹی گئی تو طباطبائی کا بیان ہے کہ اس وقت خزانہ میں ایک کروڑ روپیہ تھا۔ اس بازو کا ٹوٹنا تھا کہ دوسرا بازو بھی ایرانیوں کا بظاہر ٹوٹ گیا۔ یعنی دوسرے بھائی حسن علی خاں الملقب بہ قطب الملک نے محمد شاہ کے ہاتھ گرفتار ہو کر قید خانہ میں آخری سانسیں پوری کیں۔ تورانی امیروں کی مغل دربار میں یہ بڑی کامیابی تھی۔ محمد شاہ جو شاہی کرنے کے لئے نوکر تھا اب

اس کی جان میں جان آئی۔ کچھ دن تو محمد شاہ واقعی حضرت آصف جاہ کو وزیر اعظم بنا کر محمد شاہ بنے رہے۔ لیکن یاروں نے اس غریب کو بجائے تورانیوں کے پھر ایرانیوں کے زیبا فتر ڈال دیا۔ بادشاہ نے مذہب کو نہیں بدلا لیکن مشرب بدل دیا۔ ابر سیاہ ان کا نقیب قرار پایا۔ عام حکم تھا کہ ادھر ہمالیہ کے دامن سے گھٹا اٹھے، بادل گرجے کہ میرا خیمہ، خرگاہ صحرا روانہ ہو۔ ہر طرف سے

مے دہد صبح کلہ بستہ سحاب الصبوح الصبوح یا اصحاب

ژالہ باریدہ بر رخ لالہ! المدام المدام یا احباب

کا شور تھا۔ اسی لئے بچارا آخر میں رنگیلے کے نام سے بدنام ہو گیا۔ آصف جاہ دربار کے اس رنگ کو دیکھ کر پھر دکن کی پہاڑیوں اور جنگلوں کی طرف روانہ ہو گئے[1]۔

حریف بظاہر بادشاہ سے ملے ہوئے تھے۔ لیکن ایرانیوں کو جو زخم تورانیوں سے پہنچا تھا۔ اس کی آگ اندر اندر بھڑکتی رہتی تھی۔ آخر وہ

---

[1] کہا جاتا ہے۔ کہ داڑھی رکھنے والے اس تورانی امیر پر بیغ العداد ایرانی امراء فقرے چست کرتے تھے۔ قلعہ میں جب داخل ہوتے تو بڈھا بندر کا مشہور لطیفہ اس نیک دل وفادار بزرگ کی شان میں استعمال کیا جاتا۔ سنا گیا ہے کہ جھلا کر ایک دن حضرت آصف جاہ نے فرمایا کہ مجھے جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ لو۔ لیکن میری آنکھیں اس دن کو دیکھ رہی ہیں جب لال قلعہ کی دیواروں پر بندے چھلتے پھریں گے اور یہی فرمانے کے بعد دربار سے علیحدگی کا انہوں نے مصمم ارادہ فرما لیا۔ ۱۲۔

آگ بھڑکی اور طے کر لیا گیا۔ کہ اب اس تورانی امیر اور اس کے ساتھیوں ہمنواؤں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے۔ تاریخ میں واقعات کو بکھیر کر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ اندرونی کارروائی کیا ہوئی۔ محمد شاہ کا عہد ہے بذات خود وہ جو کچھ بھی تھا۔ لیکن اگر شاہ عبدالعزیز کی یہ روایت صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی چشم دید گواہی کے قریب قریب ہے ۔

در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند و ایں چنیں اتفاق کم مے شود۔

محمد شاہ کے زمانہ میں بائیس بزرگ صاحب ارشاد سلسلہ اور طریقہ کے دلی میں تھے۔ ایسا اتفاق کم ہوتا ہے۔

(ملفوظات عزیزیہ صفحہ ١٠٦)

ظاہر ہے کہ محض رسمی یا خاندانی پیرزادوں کے متعلق یہ بیان نہیں ہے بلکہ شاہ صاحب کے خیال میں بھی جو واقعی ارشاد و ہدایت کے سزاوار تھے ان کی محض دلی میں اتنی تعداد تھی۔ یقیناً اس قسم کا اتفاق کم ہوا کرتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باایں ہمہ رندی و خراباتی محمد شاہ میں ایک دوسری لٹک بھی ضرور تھی۔ کہ بہرحال حکومت کی قدردانیوں اور جوہر شناسیوں سے اس قسم کے اجتماعات کو بہت کچھ تعلق ہے۔

خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تو اسی رنگیلے نے

وہ رنگین سلوک کیا ہے کہ اگر مسلمان اس غریب کو محض اس کی اسی خدمت کی بنیاد پر بخش دیں تو وہ اس کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ جن مقاصد اور خیالات کو لے کر حجاز تشریف لے گئے اور حرمین کے جن "فیوض" سے مالا مال ہو کر وہ پھر ہندوستان واپس ہوئے اور کچھ طے کر کے واپس ہوئے۔ جیسا کہ ان کے اس وداعی بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ جو رخصت ہوتے ہوئے مدینہ منورہ میں اپنے استاد حدیث سے آپ نے ارشاد فرمایا تھا :۔

ہر چہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین (یعنی حدیث) (ملفوظات عزیزیہ ص۹۳)	جو کچھ میں نے پڑھا تھا۔ سب کچھ بھلا دیا۔ بجز علم دین یعنی حدیث کے۔

اور اسی بنیاد پر جیسا کہ سب جانتے ہیں حضرت شاہ صاحب ہی کی بدولت آج ہندوستان میں "علم حدیث" کا بحمداللہ مینارہ اتنا بلند ہے کہ بلا مبالغہ اسلامی ممالک میں کوئی ملک اس حیثیت سے اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ کسی معمولی آدمی کی نہیں بلکہ الازہر کے ہم وطن مشہور ناقد بصیر عالم رشید رضا مرحوم مصری کی شہادت ہے۔ اور ان کو مجبوراً واقعات کی بنا پر یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ :۔

ولولا عنایۃ اخواننا علماء الھند بعلوم الحدیث	اگر ہمارے بھائی ہندوستان کے علماء کی توجہ اس زمانہ میں علوم حدیث

فی ھذا العصر لقضی علیھا بالزوال	کی طرف مبذول نہ ہوتی تو اس علم کے زوال اور فنا کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔
(مقدمہ مفتاح کنوز السنہ ص۲)	

اور ظاہر ہے کہ یہ ساری برتری براہ راست بلا شرکت غیرے حضرت ولی رحمۃ اللہ علیہ کی رہین منت ہے۔ آج ہندوستان میں جس طبقہ میں بھی جو کچھ حدیث کا چرچا پایا جاتا ہے "ہمہ آوردۂ اوست" شاہ عبدالعزیز صاحب اسی بنیاد پر کبھی کبھی فرماتے :۔

علم حدیث پدر من از مدینہ آورد چار دو ماہ در حرمین بودہ سند کردہ	میرے والد ہی مدینہ منورہ سے علم حدیث لائے چودہ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر آپ نے سند حاصل فرما لی تھی۔
(ملفوظات ص۹۳)	

لیکن دنیا کو شاید یہ معلوم نہیں کہ شاہ صاحب نے مدینہ سے واپسی کے بعد جب درس حدیث کا افتتاح فرمایا تو اس وقت پرانی دلی میں جہاں اب ان بزرگواروں کے مزارات ہیں۔ وہاں اپنے والد کے پرانے مکان میں پڑھانے کی جو مختصر سی جگہ تھی اسی سے کام شروع کر دیا۔ لیکن چند ہی دنوں میں اطراف واکناف سے طلبہ کھنچ کھنچ کر جب پہنچنے لگے تو ظاہر ہے کہ شاہ عبدالرحیم کی درسگاہ "مسند الوقت" کے دارالعلوم بننے کا کام کیسے انجام دے سکتی تھی۔ اور یہ سعادت محمود شاہ بدنام کے نام قدرت نے لکھی تھی کہ اس نے :۔

محمد شاہ نے شاہ ولی اللہ کے درس حدیث کے لئے عالی شان مکان دیا

"مولینا کو بلا کر شہر میں ایک عالیشان مکان دے کر آپ کو اندرون شہر رکھا قدیم جگہ غیر آباد ہو گئی"۔

(دارالحکومت دہلی صفحہ ۲۸۶ ج ۲ مؤلفہ مولوی بشیر صاحب)

دلی کے پرانے کھنڈروں کا یہ سب سے بڑا ماہر دوسری جگہ اسی محمد شاہی عطیہ کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے۔

"یہ مدرسہ کسی زمانہ میں نہایت عالی شان اور خوبصورت تھا۔

اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا"۔

دارالعلوم کی پختگی اور استحکام کا اندازہ تو اسی سے ہو سکتا ہے کہ غدر تک وہ اپنی اصلی حالت پر قائم تھا۔ اگر اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش نہ آتا کہ:۔

ولی اللہی دارالعلوم کی عمارت غدر میں برباد ہوئی

"غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے کڑی، تختے تک لوگ اٹھا لے گئے" تو آج بھی وہ شاید باقی رہتا۔

رہی اس کی وسعت اور کشادگی۔ کاش! مکان موجود ہوتا تو صحیح رائے قائم ہو سکتی تھی لیکن مولوی بشیر الدین صاحب کتاب مذکور کا یہ بیان کہ:۔

"اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں۔ مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے آج پکارا جاتا ہے"۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑی جگہ تھی اسی لئے متفرق لوگوں کے مکانات اس میں بن سکے بلکہ جو محلہ "مدرسہ شاہ عبدالعزیزؒ" کے نام سے مشہور ہے اگر اس کی کل آبادی اسی مدرسہ کی زمین پر قائم ہوئی ہے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ مکان بجائے خود ایک محلہ کی گنجائش اپنے اندر رکھتا تھا اور یوں بھی تو سمجھنا چاہئے کہ جس مکان میں شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد آخر میں شاہ اسحاقؒ تک کے مشہور عظیم ترین حلقہ کے طلبہ بھی اسی میں پڑھتے رہے۔ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ محمد شاہ کا دیا ہوا یہ مکان مکان نہیں بلکہ غالباً کوئی بڑی ڈیوڑھی یا حویلی ہو گی جس میں اتنی گنجائش پیدا ہو سکی۔

مغلی عہد کی حویلیوں اور ڈیوڑھیوں کا اندازہ موجودہ زمانہ کے ہندوستانیوں کو نہیں ہو سکتا۔ تھوڑے بہت اس کے نشانات اب بھی حیدرآباد میں پائے جاتے ہیں۔ کہ ایک ایک امیر کی بعض ڈیوڑھیاں اس وقت بھی بحمداللہ شاید ایک ایک مربع میل سے کم زمین میں نہ ہوں گی۔ بہرحال مولوی بشیر الدین صاحب کتاب مذکور ہی نے لکھا ہے کہ:-

"شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے چاروں صاحب زادوں نے وہی مشغلہ (درس و تدریس) کا جاری رکھا اور اس مدرسہ نے تعلیم دینیات میں وہ نام پایا کہ ہندوستان میں شہرہ ہو گیا۔ جب شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق (مہاجر مکی) نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمہ لی۔"

جو لوگ حضرت شاہ عبد العزیز اور بالخصوص شاہ اسحاق صاحب کے حلقۂ درس کی وسعت سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ ایک زمانہ ہندوستان پر وہ بھی گزرا ہے کہ جس طرح آج ہر صوبہ اور تقریباً ہر صوبے کے ہر ضلع اور ہر ضلع کے ہر تعلقہ (سب ڈویژن) میں دیوبند کا کوئی نہ کوئی طالب علم ضرور پایا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح حضرت شاہ اسحاق صاحب کی درسگاہ کی بھی اپنے زمانہ میں یہی نوعیت تھی۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مدرسہ کی وسعت کیا ہو گی۔ اس کا پتہ تو نہ چلا کہ اس مدرسہ میں طلبہ کے قیام کا بھی بندوبست تھا یا نہیں۔ ظاہر قرین یہی ہے کہ اس زمانہ میں جب مسلمانوں نے ہر طالب العلم کے لیے قیام و طعام (لاجنگ بورڈنگ) کے مسئلہ کو فری (ادر مفت) کر رکھا تھا تو اسی دستور کے مطابق طلبہ مساجد اور ان مقامات میں رہتے ہوں گے جس کا نام اس زمانہ میں جاگیر تھا تاہم شاہ عبد العزیز صاحب کے ملفوظات میں ایک جگہ اپنے اسی مدرسہ کی مسجد کا حال بیان فرماتے ہوئے جو یہ فقرہ پایا جاتا ہے کہ،

دراں ہنگام بزرگان بسیارِ	اس زمانہ میں بہت سے بزرگ اور
اولیاء بسیار از یاران والد ماجد	بہت سے اولیاء اللہ والد ماجد کے
معتکف مسجد بودند۔ (ص۱۰۹)	دوستوں میں سے مسجد میں معتکف تھے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ کی خانقاہی حیثیت بھی تھی۔ رمضان کے مہینہ میں بھی جو عموماً عربی تعلیم کی عطلت کا زمانہ ہے "بزرگان بسیار و اولیاء بسیار" اس مدرسہ کی مسجد میں معتکف ہوتے تھے تو عام واردین و صادرین کا اسی سے

اندازہ ہوسکتا ہے

چونکہ محمد شاہ کی ایک اسلامی خدمت کا اظہار مقصود تھا۔ اس لئے قصداً میں نے ذرا طول بیانی سے کام لیا۔ اور اس سے گویہ شاہ صاحب کے مدرسہ کی حالت پر بھی روشنی پڑ گئی۔ نیز اسی مدرسہ کے کچھ حالات آخر مضمون میں بھی انشاء اللہ آئیں گے۔ اسی سلسلہ میں میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جب خود محمد شاہ نے حضرت شاہ صاحب کو بلوا کر یہ مدرسہ حوالہ کیا تھا تو عقل کا تقاضا ہے کہ حکومت نے ان طلبہ کے لئے بھی ضروری وظائف منظور کئے ہوں گے جو اس مدرسہ میں دور دور سے آتے تھے۔ کیونکہ بادشاہ تو بادشاہ عام امراء کے خزانوں سے نہ مدد وظائف طلبہ میں کافی رقموں کے دینے کا عام دستور تھا۔

حافظ رحمت خاں والئ بریلی اور نجیب الدولہ کی خدمتِ علمِ دین

حافظ الملک رحمت خاں والئ بریلی کے متعلق ان کی سوانحمری میں لکھا ہے کہ پانچ ہزار طالب علموں کو ان کی سرکار سے امداد ملتی تھی۔ نجیب الدولہ کی علم دوستی کا حال تو خود شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ

نزد نجیب الدولہ نہ صد عالم بود	نجیب الدولہ کے پاس نوسو عالم رہتے
ادنیٰ پنج روپیہ و اعلیٰ پانصد روپیہ	تھے جن میں ادنیٰ درجے کے علماء کو
ص ۸۱	پانچ روپیہ اور اعلیٰ کو پانچسو روپیہ ملتے تھے

میرا اندازہ ہے کہ یہ پانچ اور پانچسو روپیہ ماہوار نہیں بلکہ "یومیہ" تھا۔

حیدرآباد دکن میں بحمداللہ ان کی نشانیاں اب تک باقی ہیں ــــــ اور جس زمانہ میں مسلمانوں کی دولت کا یہ حال تھا کہ زیادہ دن پہلے نہیں۔ بلکہ انگریزوں کے تسلط سے کچھ ہی پہلے دلی کا حال بیان کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :ـ

کہ بخانہ قمرالدین خاں عورات غسل اخیر از گلاب مے کردند و بخانہ دیگر نواب سہ صد روپیہ گل و پان برائے عورات مے رفت۔	قمرالدین خاں کے گھر میں عورتیں آخری غسل گلاب سے کرتی تھیں۔ اور ایک دوسرے نواب کے ہاں تین سو روپیہ روز کا صرف پھول پان عورتوں میں جاتا تھا۔

اور وہی "سید برادران" جن کا حال ابھی گزرا ان میں کے بڑے بھائی حسین علی خاں جب اورنگ آباد دکن کے صوبہ دار تھے تو میر غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے :ـ

مردم اورنگ آباد بالاتفاق بیان می کنند در عہد امیرالامراء اکثر مردم درخانۂ خود طعام نمی پختند طباخان سرکار امیرالامراء حصہ خود می فروختند و قاب پلاؤ مکلف بچند پل می دادند۔ (مآثرالکرام جلد اول صفحہ ۱۷۰)	اورنگ آباد کے لوگ بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ امیرالامراء (حسین علی خاں) کے زمانہ میں اکثروں کے یہاں کھانا نہیں پکتا تھا۔ بلکہ امیرالامراء کی سرکار کے باورچی اپنے حصہ کا کھانا بیچ دیتے تھے پلاؤ کا ایک مکلف قاب چند پیسوں میں دیتے تھے۔

خیر بات بہت طویل ہوئی جاتی ہے۔ لیکن "فاقصص القصص" بھی چونکہ عبادت ہے اور اس سے بھی زیادہ "لعلھم یتفکرون" (پہلوں کے حالات سن کر شاید پچھلوں میں چونک پیدا ہو) اس لئے اس معترضہ جملے کے بیان کرنے میں مضائقہ محسوس نہ ہوا۔ اب اصل مدعا کی طرف آتا ہوں۔ تو قصہ یہ ہو رہا تھا کہ حجاز سے سندِ حدیث لے کر جب شاہ صاحب دلی واپس ہوئے اور طلبہ کے عام رجحان کو دیکھ کر محمد شاہ نے آپ کو یہ حویلی کہئے یا اس زمانہ کی زبان میں دار العلوم (کالج) قرار دیجئے۔ حوالہ کیا۔ تو شاہ صاحب اپنے منصوبوں کو دل میں لے کر اس کے مطابق سرگرم عمل ہوئے ہی تھے کہ اچانک ہندوستان خصوصاً دلی کی زمین پر نادر شاہ درانی کی مشہور مصیبت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔

حجاز سے واپسی پر شاہ صاحب کے اصل کام کا آغاز اور دلّی پر خونی نادر کی یلغار اور اس کے اسباب و اثرات

شاہ صاحب ۱۱۴۶ھ میں حجاز سے دلی پہنچے تھے اور ۱۱۵۰ھ میں نادرگردی کی دلی شکار ہوئی مؤرخین کا اس حملے کے اسباب میں اختلاف ہے۔ میاں بشیر مرحوم نے تو آصف جاہ مرحوم کو نادر کا داعی قرار دیا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے۔ اور واقعات اس کے مؤید ہیں کہ ایرانیوں کی قوت، سادات کی تباہی سے جو کمزور ہوئی تھی اسی کی تلافی کے لئے غریب تورانیوں پر نادر شاہ اکسا کر بلایا گیا تھا۔ اور

ـــــــــــــــــــــــــ

۱؎ عام تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ آصف جاہ بہادر نادر سے دوسرے دن

(باقی صفحہ ۱۶۹ پر)

بالفرض یہ سب نہ بھی ہو۔ جب بھی واقعہ یہ ضرور پیش آیا۔ کہ ہمایوں نے ایرانی جراثیم کے لئے جو سوراخ پیدا کر دیا تھا۔ نادرگردی نے اس سوراخ کو وسیع سے وسیع تر کر دیا یعنی اب تک ہندوستانی حکومت اپنے جذبۂ منّت شناسی کا اعتراف ایرانیوں کو مناصب و خدمات دے کر کر رہی تھی۔ لیکن نادرشاہی اور قزلباشی افواج کے عسکری اور سیاسی تفوق نے ہندوستانی دماغوں میں مرعوبیت کی اسی کیفیت کو پیدا کر دیا جس کا مشاہدہ آج مغربی حکومت کی مرعوبیت اور اس کے نتائج کی شکل میں ہم کر رہے ہیں۔

سیاسی شکست کا لازمہ دماغی غلامی

ہمارا ظاہر و باطن و اندر باہر صرف محکومیت اور تعبد کی تجلی گاہ بنا ہوا ہے مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ ہمارا بال بال یورپ کی غلامی کے سحر سے مسحور ہے۔ سروں کے بال اور مونچھ داڑھی کی تراش و خراش میں بھی ہماری آنکھیں اپنے مغربی آقاؤں کے چہروں کو تاکتی رہتی ہیں۔ اب ہم خود کچھ نہیں دیکھتے بلکہ جو یورپ دکھاتا ہے وہی دیکھتے ہیں۔ جو کچھ وہ سوجھاتا ہے وہی سوچتے ہیں۔ جو وہ سمجھاتا ہے وہی سمجھتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۶۸) مقابلہ کی تیاریاں کر رہے تھے بادشاہ محمد شاہ کو آپ نے ہی مشورہ دیا تھا۔ لیکن برہان الملک یعنی شاہ اودھ کے مورث نے ان کے منشا کے خلاف تنہا لڑائی چھیڑ دی اور خود اپنے کرتوت کے ہاتھ گرفتار کرا کے نادر کو دہلی لے گیا۔ اور کروڑہا کروڑ روپیہ تخت طاؤس کیساتھ جو گیا سو گیا لاکھوں انسانوں کا خون بھی بہا۔ ۱۲۔

جو وہ کھلاتا ہے وہی کھلاتے ہیں جو کچھ وہ پلاتا ہے وہی پیتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ ہم میں کتنے ہیں جو استنجا اور قضاء حاجات کی شکلوں میں بھی آج یورپ کی راہنمائی کا اپنے کو دست نگر بنائے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ وہ تماشا ہے جو حکومت کی سحر طرازیاں ہمیں اس وقت ملک کے ہر صوبہ اور ہر علاقہ بلکہ دور دست ریاستوں تک میں دکھلا رہی ہیں۔

نادری حملہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی مرعوبیت کا حال شاہ ولی اللہ کی زبانی

نادر سے ہندوستانیوں نے شکست کھائی تھی اور ایسی شکست کھائی تھی کہ جس کی نظیر کم از کم ہندی مسلمانوں کی آنکھوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے جامع ملفوظات نے ایک موقع پر یہ نقل کیا ہے کہ شاہ صاحب نے ایک دن۔

تذکرہ قتل نادر شاہی وعزم جوہر شدن شرفائے کہنہ و جواب والد ماجد و قصہ امام علیہ السلام

نادر شاہی قتل اور پرانی دلی کے شرفاء کے اس ارادہ کا ذکر فرمایا کہ وہ "جوہر" کا قطعی طور پر ارادہ کر چکے تھے۔ پھر والد نے جو جواب ان کو دیا۔ اور امام علیہ السلام کے قصہ کو بیان فرمایا

اس "جوہر" کی رسم سے شاید عام لوگ واقف نہ ہوں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی ایک قدیم رسم تھی۔ جب دشمن کا غلبہ اور تسلط اس حد کو پہنچ جاتا تھا کہ نجات و خلاصی کی راہ مسدود ہو جاتی تھی

تو یا ہن ناموس وعزت کے لئے آگ کا الاؤ جلا کر عورتیں، مرد، بچے سب اس میں کود جاتے تھے۔

شاہ صاحب کی اس شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ "نادرگردی" کی دہشت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ پرانی دلی کے شرفا آگ میں پھاندنے کی تیاریاں کر چکے تھے لیکن جیسا کہ آگے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ اس موقعہ پر شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے جب مسلمانوں کو واقعہ کربلا اور حسین علیہ السلام کے مصائب یاد دلائے اور بتایا کہ وہاں بھی تو مال وجان کے ساتھ ساتھ اہلبیت کی عزت وناموس خطرہ کی آخری شکل میں گھر چکی تھی لیکن حضرت امام نے "جوہر" کا فیصلہ نہیں فرمایا بلکہ صبر و رضا کی راہ اختیار کی تو اس ارادہ سے لوگ باز آئے۔

بہرحال اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دلی اور دلی کے ساتھ سارے ہندوستانیوں کی ایرانیوں سے مرعوبیت کا کیا حال ہوا ہوگا یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ اس "مرعوبیت" نے ہندوستانیوں کے اندر صرف ایرانی اعتقادات اور دینی مسلک کے میلان کے راستہ کو صاف کیا بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا "محکومیت" ہر قسم کے انفعالات وتاثرات کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ ہمایوں کے بعد ہندوستانی مسلمان یوں بھی ایرانی شاعری، ایرانی مفکرین اور ایرانی اربابِ علم ودانش سے بہت کچھ متاثر ہو چکے تھے مغل دربار زیادہ تر ایرانی شعراء، حکماء اور فلاسفہ سے معمور تھا جس کی تفصیل عام تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں پڑھی جا سکتی ہے۔ ورنہ مغل حکومت سے پہلے اگرچہ "ولایت" یعنی "بیرون ہند" سے ہر قسم کے لوگوں کا اس ملک میں تانتا بندھا

عربی زبان کے ایسے مصادر جن کا عام بول چال میں کم استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً باب اخشیشان، اجلواذ، احرنجام، تشعرار وغیرہ کے وزن پر زبردستی الفاظ کو تراش تراش کر لانا۔ نون تاکید اور باب تفعیل کی تشدید سے کلام میں زور پیدا کرنا، ایسی چیزوں کی جمع بنانا جن کی طرف بآسانی ذہن منتقل نہ ہو سکے مثلاً عام طور سے منطقی اور کلامی طبقوں میں "لانسلم" (ہم یہ نہیں مانتے) یا لم لا یکون کذا (آخر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا) وغیرہ الفاظ کا استعمال بکثرت کیا جاتا ہے خصوصاً ارباب جدل و مناظرہ کی زبانوں پر تو گویا یہ الفاظ بطور سخن تکیہ کے چڑھتے رہتے ہیں۔ میر باقر نے ان لوگوں کا نام ہی "لانسلمیون" اور "لم لایکونیون" رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ اس جمع کو دیکھ کر بآسانی کس کا دماغ ان کے مفردات کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس زمانہ کے شروح و حواشی خصوصاً دوانی اور صدر معاصر نے شرح تجرید کے حاشیوں میں قدیمہ، جدیدہ، اجد وغیرہ کے ناموں سے بے معنی مباحث کا جو طوفان پیدا کیا تھا اور اس پر مرزا جان اخوند یوسف، آقا حسین خونساری وغیرہ نے "خوکوہ کندن کاہ برآوردن" کی خدمتیں انجام دی تھیں۔ میر باقر نے ان ہی سب کو سامنے رکھ کر اپنے جدید انشاء اور ادب کا ان کو تختۂ مشق بنایا۔ گویا ایک قسم کے منطقی اور سالبی ادب کی اس نے ایجاد کی۔ اسی کے ساتھ میر داماد نے اپنی کتابیں جن میں تقریباً ایک ہی قسم کے مضامین ہیں ان کے نام بھی عجیب غریب قسم کے رکھے۔ جن کے سننے کے ساتھ ہی آدمی پر ایک رعب سا چھا جاتا ہے مثلاً الافق المبین، الصراط المستقیم، ایماضات، تقدیسات،

قلبیات ازیں قبیل اور بھی چند کتابیں ہیں۔

غرض میرے نزدیک تو میر باقر پر بجائے فلسفہ اور منطق کے فی الحقیقت ادب وشعر ہی غالب تھا۔ اس کا اندازہ علاوہ ان تدبیروں کے اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نظامی گنجوی کی پانچ نظم کی کتابوں کا شمار فارسی شاعری کے جواہر پاروں میں تھا۔ اور "جواہر خمسہ نظامی" کے نام سے یہ مجموعہ عام طور پر مشہور رہے۔ میر باقر نے بھی اپنی پانچ کتابوں کو "جواہر خمسہ" کے نام سے ملقب کیا۔

میر باقر کے ایک شاگرد صدر شیرازی

میر باقر کے بعد ان کے شاگردوں میں ایک اور صاحبِ قلم (بلکہ "صاحب قلم" سے زیادہ "صاحب سیاہی ورہ وشنائی" کا خطاب ان کو دیا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا) پیدا ہوئے یعنی ملا صدرالدین شیرازی جن کی کتاب شرح ہدایت الحکمۃ صدرا کے نام سے مدرسوں میں آج بھی مشہور ہے۔ یہ شخص بلا کا لکھنے والا تھا۔ ہزارہا صفحات کی بیسیوں کتابیں مثلاً تعلیقات شفا یا حواشی شرح حکمت الاشراق "شواہد ربوبیت" وغیرہ کے علاوہ ایک بسیط کتاب اسی لفظی فلسفہ کے متعلق چار ضخیم جلدوں میں اس شخص نے تیار کی جس کا نام "اسفار اربعہ"[1] ہے اس کے زمانہ تک لایعنی مباحث کا

[1] حکومت آصفیہ کے دار الترجمہ نے فلسفہ کی اس ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ کرا دیا ہے جس کی پہلی جلد کا ترجمہ خاکسار نے اور باقی جلدوں میں سے ایک حصہ کا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اور دوسرے حصہ کا مولوی میرک شاہ کشمیری نے کیا ہے۔ دنیا کی کسی (باقی ص۱۷۶ پر)

جو ذخیرہ جمع ہو چکا تھا سب کو تلاش کر کے اس نے اپنی کتاب میں جمع کیا۔ اور اس کے ساتھ بعض مسائل میں اپنے خاص نظریات بھی قائم کئے۔ اسانذہ سے ان کا رنگ اس اعتبار سے جدا ہے کہ ثقیل و غریب لفظوں کے طمطراق سے ان کی کتابیں خالی ہیں صرف اسفار کے عنوانوں میں سہروردی کی کچھ جھلک پائی جاتی ہے مثلاً لمعہ اشراقیہ "حکمتہ عرشیہ وغیرہ۔

بہرحال جس وقت ہندوستان میں عہد شاہجہانی و عالمگیری گزر رہا تھا۔ ایران کی زمین ان لفظی فلسفیوں کی علمی جلالت شان کے غلغلوں سے گونج رہی تھی اور ہندوستان وہی ہندوستان جس نے ہمایوں کی راہ سے اپنا رشتہ ایران سے جوڑ لیا تھا۔ اس میں ان غلغلوں کی صدائے بازگشت آ آکر ٹکرائی تھی۔ اب تک کسی میدان میں اسلامی ہند نے چونکہ شکست کی رسوائی نہیں اٹھائی تھی اس لئے ایران کی ان آوازوں سے اتنا تو متاثر نہیں ہوا جتنی کوئی محکوم مفتوح قوم متاثر ہو سکتی ہے لیکن میل ملاپ اور احسانمندی کے جذبات نے ہندوستان کو اتنا متفعل ضرور کر دیا کہ جو ملک اب تک صرف تصوف و فقہ کی جولان گاہ تھا اب ان علوم سے ہٹ کر آہستہ آہستہ اس کا میلان ایرانیوں کے ان لفظی گورکھ دھندوں کی طرف فلسفہ اور منطق یا

(بقیہ ص ۱۷۵) زبان میں فلسفہ کی اتنی بڑی کتاب شاید ہی موجود ہو گی۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فلسفہ چونکہ نام ہی وسوسہ کا ہے۔ مشرقی ہو یا مغربی لیکن اگر علم اس کا نام ہے تو صدر شیرازی کا یہ ایسا کام ہے جس میں ڈھونڈنے والے فلسفہ کے ہر مکتب خیال والوں کے خیالات تلاش کر کے نکال سکتے ہیں۔

عقلیات کے پر شوکت ناموں سے بڑھنے لگا۔ زیادہ دن نہیں گزرنے پائے کہ بالآخر پرانے ذوق پر یہ جدید شوق غالب آگیا اور ایسا غالب آیا کہ عالمگیر کے عہد کے ایک مشہور عالم جو عالمگیری فوج میں ایک بڑی مذہبی خدمت یعنی فریضۂ احتساب پر ملازم تھے جس کا براہ راست تعلق فقہ اور فقہی مسائل کی تفصیلات ہی سے ہے۔ فقہ اور اس کے جزئیات سے جو پورے طور پر واقف نہ ہو صحیح طور پر اس فریضہ کا انجام پانا اس سے مشکل ہے۔ میری مراد مرزا زاہد سے ہے جو اس وقت تک عربی مدارس میں اپنے "زواہد ثلثہ" کی بدولت خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ اور منطق و فلسفہ میں حضرت شاہ ولی اللہ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم کے استاد ہیں ان ہی میر زاہد صاحب کے متعلق جو آگرہ میں صدر محتسب عساکر عالمگیر تھے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز راوی ہیں کہ :۔

میرزا زاہد ہروی اور علم فقہ میں اُن کی کمزوری

امیرے شرح وقایہ می خواند۔ بے حضور پدر بزرگوار سبق نمی فرمود۔ (ملفوظات ص ۸۲)

ایک امیر زاہد سے شرح وقایہ پڑھتا لیکن فقہ میں میر زاہد کو اپنے اوپر چونکہ اعتماد نہ تھا۔ اس لئے جب تک دادا (حضرت شاہ عبدالرحیم) نہ آجاتے۔ میر صاحب سبق نہیں پڑھاتے تھے۔

شرح وقایہ پڑھانے میں تو محتسب صاحب کا یہ حال تھا لیکن اسی کے مقابلہ میں معقولات سے آپ کے تعلق کی جو نوعیت تھی شاہ عبدالعزیز ہی نے

ان کا یہ دلچسپ فقرہ نقل کیا ہے کہ میرزا جان اور اخوند یوسف جن کے دوانی کے حواشی پر حواشی ہیں۔ ان دونوں کے متعلق میرزا زاہد کہا کرتے تھے۔

معقولات میں میرزا صاحب کا غلو

تقریر میرزا جان جان من است و تقریر اخوند جان جان من است[1] میرزا جان کی تقریر تو میری جان ہے۔ اور اخوند کی تقریر میری جان جاناں ہے۔

اور اس زمانہ میں کچھ بیچارے میرزا زاہد ہی کا حال نہ تھا تقریباً علماءٔ کے اکثر افراد پر یہی کیفیت طاری تھی تاہم "حملہ نادری" سے پہلے ہندوستان کے علماء ایرانی فضلاء میں فانی نہیں ہوئے تھے۔ ان کے اعتراف فضل و مہارت کے ساتھ اپنی کمتری کا احساس ان میں نمایاں نہ ہوا تھا۔ اسی لئے بجائے تقلید جامد کے ان کے انفعالی تاثرات بظاہر مقابلہ کے رنگ میں ظاہر ہوتے تھے۔ میر باقر نے اپنی کتاب "الافق المبین" کا نام قرآن سے

۱؎ مگر باوجود اتنی معقولیت کے اس زمانہ کے معقولی کا یہ حال تھا کہ شاہ عبدالرحیم صاحب کی میرزا زاہد سے رمضان میں ایک دن دعوت کی اس عرصہ میں ایک کباڑی نے کتابوں سے بھرا ہوا خوانچہ میرزا کے پاس لاکر رکھا کہ "نیازے آوردہ ام"۔ مرزا نے کہا۔ "اے عزیز! پیر تو نہ ام، استاد تو نہ ام نیاز چہ معنی؟ آخر ردوکد کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی دکان کو مرزا کے سپاہی غلط جگہ پر ہونے کی وجہ سے اٹھانا چاہتے ہیں اسی کی رشوت میں لایا ہے آخر دام دے کر لینا طے ہوا۔ لیکن ڈھائی روپے کی کتاب آٹھ آنہ میں دے رہا تھا مرزا کو معلوم ہوا سخت برہم ہوئے اور پورے دام ادا کئے۔ ۱۲۔ انفاس ص۳۲

استعمال کیا تھا۔ ٹھیک اسی کے توڑ پر شاہجہان کے عہد میں جونپور کے مشہور فلسفی ادیب ملا محمود جونپوری نے بالکل اسی طمطراقی طرز پر تو نہیں جو ملا باقر کی خصوصیت ہے۔ لیکن اچھے خاصے بلند انشائی رنگ میں فلسفہ کی ایک کتاب تصنیف کی اور انہوں نے بھی قرآن مجید ہی سے اس کا نام "الشمس البازغہ" اقتباس کیا۔ اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں ملا محب اللہ بہاری نے اپنی مشہور دونوں درسی کتابوں یعنی مسلم وسلم کے نام میں بھی ایک ادیبانہ پہلو ملحوظ رکھا اور دونوں کتابوں میں ڈھلے ڈھلائے ترشے ترشائے فقرے جہاں تک میرا خیال ہے میر باقر ہی سے شعوری یا غیر شعوری اثر پذیری کی بنیاد پہ داخل کئے گئے ہیں۔ مگر اب تک دونوں ممالک کے فضلا گویا ایک حد تک "رقیبانہ" تعلقات رکھتے تھے مگر سچ ہے کہ غیر محسوس طور پر ایران کے تفوق کو وہ اپنے طرز عمل سے گونا تسلیم کرتے جاتے تھے۔

نادری حملہ کے بعد یہاں کے علماء ایرانی علوم و نظریات سے بری طرح متاثر ہوئے

لیکن "نادری حملہ" نے تو اس نامحسوس کو محسوس اور غیر شعوری انفعال کو شعوری بنادیا بلکہ جیسا کہ تمام مفتوح ہزیمت خوردہ اقوام کا قاعدہ ہے انہوں نے اپنے اس انفعال و تاثر کو سرمایہ صد افتخار اور موجب ہزار ناز و امتیاز قرار دے دیا جس کا اندازہ ہندی علماء کی ان کتابوں سے ہو سکتا ہے جو "حملہ نادری" کے بعد ہندوستان میں لکھی گئیں۔ میر باقر کا نام اسی کے بعد

"خیر الحقہ بالمہرہ" "سیالا ذکیا" اور خدا جانے کیا کیا ہو گیا۔

اس بحث میں ذرا زیادہ بسط سے میں نے قصداً کام لیا ہے۔ کیونکہ آئندہ جیسا کہ معلوم ہو گا حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے قلم نے جہاں اور کام انجام دئے ہیں ایران کی اس ذہنی مرعوبیت کے ردعمل میں بھی اس نے کامیاب کوشش کی ہے۔ حضرت کی اس خدمت کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس عہد کی اس ذہنی و علمی کیفیت کا کم از کم اجمالاً حال لوگوں کو معلوم نہ ہو جس کا میں نے اس وقت ذکر کیا اب میں پھر اصل مبحث کی طرف توجہ کرتا ہوں کہ نادر ہندوستان سے لے جانے کو تو جو کچھ بھی لے گیا لیکن اسی کے ساتھ ایک مصیبت بھی چھوڑ گیا۔ یعنی ایران کے دینی رجحانات اور ذہنی اور دماغی میلانات میں قدرتاً مفتوح ہندوستانیوں میں جو پہلے سے بھی بہت کچھ متاثر تھے۔ اور بھی شدت پیدا ہو گئی بلکہ نادرشاہ اگر یوں ہی مار پیٹ اور تاخت و تاراج کر کے نکل بھاگتا تو شاید عداوت و بغض کی وجہ سے کوئی دوسری کیفیت پیدا ہوتی۔ لیکن ہوا یہ کہ :۔

نادرشاہ کا بے پناہ رعب

ساری خواری و ذلت اور بربادی و تباہی کے باوجود سہمے ہوئے بادشاہ محمد شاہ نے نادرشاہ کی باضابطہ مفتوں مہمانی کی۔ دربار کے بڑے بڑے امراء نادرشاہ کی خدمت پر مقرر ہوئے۔ عمدۃ الملک جیسا امیر و کبیر بیچارہ نادر کو قہوہ پلانے پر مامور ہوا تھا اور یہی حال دوسرے امیروں کا ہوا تھا

"بہر حال محمد شاہ ضیافت نادر شاہ بکمال تکلف قرار داد" اور بات اسی پر ختم نہ ہوئی بلکہ اسی کے ساتھ نادر شاہ نے

نادر شاہ کے لڑکے کے نکاح میں شاہجہان کی پوتی

دخترے از اعقاب شاہجہان پادشاہ در حبالۂ نکاح پسر کوچک خود نصر اللہ مرزا کہ ہمراہ داشت درآورد (سیر ۳۰۵)

شاہجہان بادشاہ کی پوتیوں میں سے ایک لڑکی نادر کے چھوٹے لڑکے نصر اللہ مرزا کے نکاح میں دیدی۔ جو اس کے ساتھ ایران سے ہندوستان آیا تھا۔

ہندوستانی امراء بلکہ خود شاہی خاندان والوں سے صدیوں کے ناز و تنعم نے حمیت و غیرت کی حرارت یوں بھی بجھا دی تھی اب یہ عزیزداری کا رشتہ جوش انتقام کو فرو کرنے کے لئے ان کے بزدل قلوب کے لئے بہانہ مل گیا اور یوں بزدلی کے رذیلہ پر جذبۂ رواداری اور وسعت چشمی کی چادر اڑھا دی گئی۔ نادر نے جو کچھ کیا دھرا تھا سب بھلا دیا گیا۔ "آقا خوش آمدید" کے ساتھ ہر ایرانی کا ہندوستان میں خیر مقدم ہونے لگا۔ ان کی کتابیں شوق سے پڑھی جانے لگیں۔ ان کے علماء کی باتیں دلچسپی سے لوگ سننے لگے اور اس کے جو نتائج ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

نادر شاہ ہی کے طفیل ہندوستان میں روہیلہ پٹھانوں کا سیلاب

لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ نادر کابل و قندھار کے راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ راستہ میں ان علاقوں کے باشندوں نے مزاحمت کی۔

لیکن باوجود اپنی مشہور جلادت و شجاعت کے قزلباشوں کی ضرب کی تاب نہ لاسکے۔ ہر جگہ ان کے پاؤں اکھڑتے چلے گئے اور نہ صرف کابل و قندھار بلکہ سرحد کے آفریدی و مہمندی مسعودی اور دوسرے جان باز جان فروش قبائل بھی نادر کے ہلّے کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ ایسا عجیب و غریب واقعہ کیسے پیش آیا۔ تاریخ کا یہ اہم سوال ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے تاہم بعض اشارات تورانی و ایرانی تنازعات کے قصّہ میں مل سکتے ہیں غور کرنے والے شاید ان کی مدد سے صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

بہرکیف یہ واقعہ تھا کہ ہر جگہ کابل و قندھار و سرحد کے پٹھانوں کو بھی نادر کے مقابلہ میں زک اٹھانی پڑی اور ہر جگہ "خونی نادر" نے ان پر عافیت تنگ کی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ہزیمت خوردہ پراگندہ قوم اپنے علاقوں سے بھاگ بھاگ کر ہندوستان میں پناہ ڈھونڈنے لگی اور

جمعے ازاں قوم پراگندہ بہ ہندوستان درآمدہ۔ در ہر جا سکنی و اکثر در سرکارات ملازم شدہ داخل شدہ گشتند۔ (سیر صفحہ ۴۸۰)	اس پراگندہ پریشان قوم کا ایک حصہ ہندوستان پہنچا۔ اور ہر جگہ انہوں نے سکونت اختیار کی اور ملک کی مختلف سرکاروں (علاقوں) میں انہوں نے ملازمت اختیار کرلی۔

اور مختلف سرداروں کی ماتحتی میں جتھے بنا بنا کر انہوں نے چند دنوں میں اپنے مختلف مرکز قائم کرلئے خصوصاً

محمد خاں معروف بہ روہیلہ مورد   محمد خاں جو روہیلہ کے نام سے

التفات اعتمادالدولہ گردیدہ بعضے جاگیرات وخالصہ را بطور ملکیت قابض ومتصرف بر توجہات وزیر گشت۔

مشہور ہے وہ اعتمادالدولہ (امین خان) کی نظر التفات سے سرفراز اور اسی وزیر کی توجہ سے بعض اور جاگیروں خالصہ وغیرہ پر بطور مالک ہونے کے قابض ہو گیا۔

چوں صاحب جرأت شخص صاحب ارادہ وشعور بود ہمیں افغانان و روہیلہائے گریختہ قندہار و اطرافش را باخود رفیق ساختہ بنام روہیلہ اشتہار واز اجتماع آنہا اقتدار یافت۔ ملک بسیارے را مثل آنولہ وسنبھل ومرادآباد وبداؤں وبریلی وغیرہ متصرف گشت۔ ص ۱۸۰

چونکہ محمد خاں جرأت و ہمت والا آدمی تھا اور ارادہ وعزم اور تمیز و شعور کا بہرہ رکھتا تھا۔ اس نے قندہار اور اس کے گرد ونواح کے بھاگے ہوئے روہیلوں کو اپنے ساتھ کر لیا۔ روہیلے کے نام سے اس کی شہرت ہوئی اور ان لوگوں کے جمع ہو جانے سے اس شخص کو اچھی خاصی قوت حاصل ہو گئی ملک کا ایک بڑا علاقہ مثلاً آنولہ، سنبھل، مرادآباد، بدایوں، بریلی وغیرہ کو اپنے تصرف میں لے آیا۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے پہلے اس علاقے کے باشندے ہندوستان میں نہیں پائے جاتے تھے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنے ملک کو بے سروسامانی کے ساتھ روہیلوں کی ایک بڑی تعداد دیکھا یک جو ہندوستان کے بالائی علاقوں اور خصوصاً دہلی میں پھیل گئی۔ تو اس کا سبب یہی نادر اور اس کی

عجیب و غریب لشکر کشی تھی۔ اب ہوا یہ کہ ایک طرف نادر کی وجہ سے ایرانی اور ایرانی مذہب و ذہنیت رکھنے والوں کو ملک میں تفوق حاصل ہوا اور ان ہی کے ساتھ ایک اور جدید عنصر بالکل ان کے متقابل یعنی روہیلوں کا بھی اقتدار ہندوستان میں جڑ پکڑنے لگا۔ تیسرا عنصر تورانیوں کا تو پہلے ہی سے موجود تھا کہ حکومت ہی تورانیوں کی قائم کی ہوئی تھی ——— جیسا کہ میں نے عرض کیا آخر زمانہ میں اورنگ زیب کے بعد تورانی اور ایرانی سوال میں کافی شدت پیدا ہوتی چلی جاتی تھی۔ جس کی بظاہر تعبیر تورانی و ایرانی سے کی جاتی تھی۔ لیکن در اصل یہ مقابلہ سُنیوں اور شیعوں میں تھا سُنیوں کا نام تورانی رکھا گیا تھا اور شیعوں کو کبھی ایرانی اور کبھی "سادات" کے نام سے خصوصاً "سیر المتاخرین" کے مصنف جو خود شیعی ہیں یاد کرتے ہیں ایک موقعہ پر طبا طبائی نے ان تورانی بیچاروں کے متعلق جن میں سب سے زیادہ بدنام آصف جاہ بہادر کا خاندان تھا۔ ان کے خاص چچا زاد بھائی اعتماد الدولہ کے متعلق طبا طبائی لکھتے ہیں :-

اعتماد الدولہ تورانیاں کہ اعتماد الدولہ وغیرہ تورانی جو سادات
عداوت سادات را سرمایا سعادت کی دشمنی کو اپنی سعادت کی پونجی خیال
خود دانستہ (۴۷۸) کرتے ہیں۔

الغرض یہ دو متقابل عناصر تو ہندوستان میں پہلے ہی سے موجود تھے اور گو طبا طبائی دونوں فرقوں کی باہمی عداوتوں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے تورانی جن لوگوں کا نام رکھا گیا تھا یہ

عموماً ترکستان یعنی بخارا، سمرقند، تاشقند، خیوہ، کاشغر وغیرہ کے لوگ تھے۔ اور جن لوگوں کو ان ممالک کے حالات کا خصوصاً جس زمانہ سے ہم بحث کر رہے ہیں علم ہے وہ جانتے ہیں کہ اس وقت اس ملک کے مسلمان بہ نسبت فقہار اور علمار کے زیادہ تر حضرات صوفیہ کرام کے زیر اثر تھے۔ اور تصوف کی لوگ جو کچھ بھی خرابیاں بیان کریں لیکن اتنا تو ہر شخص کو ماننا پڑے گا کہ صوفیانہ مسلک رکھنے والے نفوس بجائے تنگ چشم ہونے کے وسیع المشرب ضرور ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر "الصوفی لا مذھب لہٗ" کا مقولہ مشہور و معروف ہو گیا ہے۔ بلکہ بعضوں کا تو خیال ہے کہ صوفیوں اور شیعوں میں بجائے تخالف اور تصادم کے توافق کے جہات زیادہ ہیں۔ اور اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ تصوف کا بہت کچھ میلان تشیع کی طرف رہا ہے۔ جس کی ایک مثال شاید خود حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی بھی ہو سکتی ہے۔ کہ مسئلۂ خلافت کے متعلق کہاں تو آپ کی رائے یہ ہے کہ عام اشاعرہ جو

تقریر می کنند کہ خلافت ایشاں بہ نص نیست مطلقاً یا بہ نص جلی نیست بلکہ امر اجتہادی ست کہ اہل عصر بنابر اجتہاد بر آں اتفاق نمودند۔	یہ کہتے ہیں کہ (حضرت خلفاء) کی خلافت مطلقاً کسی نص سے ثابت ہی نہیں ہے یا نص صریح واضح سے ثابت نہیں ہے۔ بلکہ ایک اجتہادی بات ہے۔ اس زمانہ کے لوگ اپنے اجتہاد اور غور و فکر سے

ان لوگوں کی خلافت پر متفق ہو گئے۔

تو اشاعرہ کا یہ خیال شاہ صاحب کے نزدیک درست نہیں ہے بلکہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازاں علم شریف نصاً و اشارۃً خبر دادند تا آنکہ تکلیف عباد باستخلاف ایں بزرگواراں عملاً و اعتقاداً مستحق شد و پردہ از روی کار بر انداختہ گشت۔

بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شریف علم کی نص اور اشارہ ہر طریقہ سے خبر دی ہے حتیٰ کہ اسی بنیاد پر اللہ کے بندے اس بات کے مکلف ہوئے کہ ان بزرگوں کو خلیفہ مقرر کریں اور عملاً و اعتقاداً یہی بات واجب ہوئی۔

یہ اس ازالۃ الخفاء کے مصنف علام کی رائے ہے جس کو پڑھ کر وہی نہیں جو خاندان ولی اللہی کے حلقہ بگوشوں میں ہیں بلکہ وہ بھی جن کے متعلق مشہور کیا گیا ہے کہ بجائے عقیدت و نیاز کے ہمیشہ نسلاً بعد نسل اپنے گروہ علم کے اس سلسلہ اور خانوادہ کے حریف مقابل سمجھا کئے میری مراد مولانا فضل حق خیر آبادی سے ہے۔ اُن کے بڑے مداح شاگرد مولانا محسن بہاری رحمۃ اللہ خود اپنی براہ راست سنی ہوئی شہادت ادا کرتے ہیں کہ جب الور میں مولانا فضل حق سے وہ پڑھا کرتے تھے تو اسی زمانہ میں

وقعت فی یدہ نسخۃ من کتاب ازالۃ الخفا فکان اولع بھا و یکثر النظر

مولانا فضل حق کے ہاتھ ازالۃ الخفا کا ایک نسخہ کہیں سے لگا مولانا اس کے مطالعہ کے حریص تھے۔ اور جب

فیھا او ان فراغہ من درسہ وسائر ما یشغلہ من شانہ فلما وقفت علی شئ کثیر منھا قال بحضر من الناس وکنت فیھم الذی صنف ھذا الکتاب لبحر ذخار لا یری لہ ساحل (الیانع ص۹۳ مطبوعہ علی رجال الطحاوی)

درس و تدریس یا دوسرے مشاغل سے فرصت ملتی تو بکثرت اسی کتاب کے مطالعہ میں معروف رہتے جب مولانا اس کتاب کے بڑے حصّہ کو پڑھ کر فارغ ہوئے تب آپ نے سب کے سامنے جن میں میں بھی شریک تھا یہ فرمایا کہ جس شخص نے یہ کتاب تصنیف کی ہے وہ تو ایک دریائے بے کراں ہے جس کے ساحل کا پتہ نہیں چلتا۔

مگر اسی "ازالۃ الخفاء" کے مصنّف نے فیوض الحرمین میں جو یہ لکھا ہے۔ کہ

ان طبیعتی وفکرتی اذا ترکنا و انفسھا فضلتا علیًا کرم اللہ وجھہ واحبتاہ اشد محبۃ۔

میری طبیعت اور میری فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت سے شدید محبت ہے۔[1]

---

[1] شاہ صاحب کی طبیعت کا یہ میلان اسی قسم کا تھا جیسا کہ عموماً لوگوں کو اپنے روحانی بزرگوں کے اعزہ و اقارب خصوصاً ان کی اولاد کی طرف ہوتا ہے جو صرف "طبیعت" ہی کا اقتضا ہوتا ہے اور امور دین میں طبیعت کے اس اقتضا کو کوئی دخل نہیں (باقی ص۱۸۸)

تو کیا آپ کی طبیعت و فکرت کا یہ رنگ اسی تصوف کا نتیجہ نہیں ہے جس سے آپ کابراً عن کابرٍ وارث تھے۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ دربار رسالت سے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں الوصاۃ تفضیل الشیخین یعنی شیخین (حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو فضیلت دینے کی وصیت ہوئی اس لئے فرماتے ہیں کہ یہ تفضیل شیخین کا اعتقاد

شیئٌ طلب منی التعبد به	ایک ایسی چیز ہے کہ میری ذاتی
خلاف المشتهی وھیھات	خواہش کے خلاف مجھے اس کے
ھذہ المناقضات منی	ماننے اور عبادت خدا سمجھ کر ماننے
لولا ان شدۃ الجامعیۃ	کا حکم دیا گیا ہے افسوس مجھ میں یہ کس
ھی التی اوقعتنی فی ذالک	قسم کی متناقض اور متضاد باتیں ہیں
(فیوض الحرمین ص۶۵)	لیکن مجھ میں شدید جامعیت کا جو رنگ

پایا جاتا ہے اسی نے اس حال تک مجھے پہنچایا ہے۔

خیر یہ تو بیچ کا ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمایوں کے کے بعد مغل دربار میں تورانیوں اور ایرانیوں یا دوسرے لفظوں میں سُنّیوں

(بقیہ ص۱۸۷) بلکہ یہاں اصل چیز کتاب و سنت کے دلائل ہیں۔ تو چونکہ دلائل کا فیصلہ تفضیل شیخین کے حق میں تھا جیسا کہ خود شاہ صاحب نے ہی ازالۃ الخفا اور قرۃ العینین میں پورے شرح و بسط کے ساتھ اس کو ثابت فرمایا ہے اس لئے شاہ صاحب نے اپنی ذاتی چاہت اور طبعی میلان کے خلاف اسی کو اختیار فرمایا پھر روحانی مکاشفہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی آپ کو تفضیل شیخین ہی کی وصیت ہوئی۔ ۱۲

اور شیعوں دونوں کی آمد ہو رہی تھی۔ دونوں طبقوں کے امرا حکومت کی مشین میں داخل ہو ہو کر اپنی اپنی فراخور قابلیت کے لحاظ سے پرزے بنتے چلے جاتے تھے۔ اور گو ان دونوں میں رقابتیں ضرور رہتی تھیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ محض سُنّی ہونے یا شیعہ ہونے کی وجہ سے اس اختلاف نے کبھی کسی سخت خطرناک فساد کی شکل اختیار نہیں کی۔

جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ اولاً تو باہم مذہبی مناقشوں کا کوئی ایک دوسرے کو موقعہ ہی نہیں دیتا تھا۔ بلکہ حتے الوسع ہر ایک دوسروں کے جذبات کا عموماً خیال کرتا تھا اور گاہے ماہے اگر کوئی ناخوش گوار گفتگو اس سلسلہ میں ہو بھی جاتی تو اسے غیر معمولی اہمیت نہیں دیجاتی تھی۔ اور بات وہیں رفع دفع ہو جاتی تھی اور خواہ مخواہ اس کو جماعتی جھگڑا بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ باقی پچھلے دنوں میں "سادات بارہ" کا جو قضیہ نامرضیہ پیش آیا اس میں شک نہیں کہ یاروں نے اس میں ایک حد تک شیعہ سنّی کے اختلاف کا رنگ ضرور بھرا اور خوب بھرا۔ امیرالامرا حسین علی خاں کے قتل پر مرثیے لکھے گئے اور بڑے دردناک مرثیے لکھے گئے۔ گویا اس واقعہ کو کربلا ثانی ٹھہرادیا گیا میر عبدالجلیل بلگرامی کا مرثیہ تو اسی مشہور مصرعہ سے شروع ہوتا ہے ؎

آثار کربلاست عیاں از زمین ہند

اس باب میں اتنے غلو اور مبالغے سے کام لیا گیا کہ جب جانسٹھ کی جنگ میں حسین علی خاں کے ایک عزیز سیف الدین خاں لڑتے ہوئے

کام آئے۔ تو طبا طبائی جیسے روشن خیال بزرگ نے بھی اس کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن دنوں یہ واقعات پیش آئے :-

از معتمدان مسموع افتاد کہ دراں ایام علی التواتر سرخی شفق صبح وشام بمرتبہ از دیاد داشتند کہ گویا دامن فلک جفا کار آلودۂ خون مظلوماں ودیدہ لیل ونہار بر ماتم آں ابرار خوں فشاں ست۔	معتبر لوگوں سے یہ بات سنی گئی کہ ان دنوں میں مسلسل صبح و شام نے شفق کی سرخی اتنی زیادہ تیز ہو جاتی تھی کہ گویا فلک کا دامن مظلوموں کے خون سے آلودہ ہو رہا ہے اور دن و رات کی آنکھیں ان عزیزوں کے ماتم میں خوں فشاں ہیں۔
صفحہ ۷۴۴ ج ۱	

لیکن جو اصل واقعات سے واقف ہیں اور اجمالاً میں بھی کچھ پہلے ذکر کر چکا ہوں۔کیا اُن کے دیکھنے والے ایک لمحہ کے لئے بھی "سادات بارہ" کے جھگڑوں کو واقعی کسی مذہبی سوال کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں —؟ تاریخ اسلام میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔اس سے پہلے بھی مختلف مواقع پر جاہ واقتدار کے متوالوں نے اپنے اپنے ہم خیالوں میں ہمدردی کا فتنہ پیدا کرنے کے لئے اپنی اپنی خواہشوں پر مذہب کا نقاب چڑھایا تھا۔(والقصۃ بطولہا)

بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ نادر شاہی تلوار کی شرر باریوں اور برق افشانیوں نے روہیلوں کی ایک بڑی تعداد کو جب اپنے اپنے علاقوں سے

منتشر اور پراگندہ کرکر کے ہندوستان کی طرف دھکیل دیا۔ تو ایرانی و تورانی عناصر کے ساتھ اب ملک اور دربار دونوں میں ایک جدید موثر عناصر کا اضافہ ہو گیا۔ اور بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ نادر شاہ کی واپسی اور راستہ میں اچانک اُس کے قتل کی وجہ سے جب شاہ ابدالی کو کابل و قندھار کے علاقوں میں تسلّط حاصل ہوا اور مختلف اسباب و وجوہ کی بنیاد پر ایک دفعہ نہیں بلکہ مسلسل تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ صرف روہیلوں کے جرگوں کو ساتھ لے کر شاہ ابدالی نے ہندوستان پر سات حملے کئے۔ جن میں آخری حملہ وہی تھا جو "پانی پت کی مرہٹہ جنگ" کے نام سے مشہور ہے۔ جس کا اجمالاً ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ اس طرح نادر شاہ کے ستائے ہوئے خانہ برباد روہیلوں کے لئے شاہِ ابدالی نے زمین تیار کردی کہ وہ ہندوستان کی اس حکومت میں جس پر عالم سکرات طاری تھا۔ اور ہر طرف طوائف الملوکی کا دَور دَورہ تھا اپنے لئے مواقع فراہم کریں۔ علی محمد روہیلہ تو پہلے ہی سے ایک مرکز تیار کر چکا تھا۔ اور وہی علاقہ جو آج روہیل کھنڈ کے نام سے موسوم ہے۔ اُن کے تسلّط کی آماجگاہ بنا ہُوا تھا۔ ان کے نفوذ اور اثر کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ علاقہ اُن ہی کے نام سے مشہور ہو گیا اور اب تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ خصوصاً "مرہٹی فتنہ" کے استیصال کے بعد شاہِ ابدالی رحمتہ اللہ علیہ نے سلطنت دہلی کا جو نظم قائم کیا۔ یعنی بادشاہ شاہ عالم (جو اس وقت شاہزادہ عالی گہر کے نام سے مشہور تھے) یہ تو بادشاہ

ہیں گے اور امیر الامرائی کی خدمت نجیب الدولہ روہیلہ کو اور وزارت کا چارج نواب وزیر اودھ کے سپرد ہوا۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ روہیلوں کا ملک پر ایسا اقتدار قائم ہو چکا تھا جس سے قطع نظر نا ممکن تھا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اب ملک میں تین عنصر پیدا ہو گئے تھے۔ یعنی ایرانی، تورانی، روہیلے۔ اس لئے شاہ ابدال نے بادشاہی تو تورانیوں میں رکھی کہ وہی اب تک اس کے خاندانی طور پر مستحق تھے۔ وزارت ایرانیوں کو یعنی شیعوں کو دی گئی اور امیر الامرائی کا عہدہ ایک روہیلہ امیر نجیب الدولہ کے سپرد ہوا۔

روہیلوں کا حکومت دہلی کے ایسے جلیل منصب پر اقتدار حاصل ہونے کا لازمی نتیجہ تھا کہ روہیلے جو اب تک اپنا ماویٰ ملجا زیادہ تر روہیل کھنڈ کو بنائے ہوئے تھے۔ اب دلی میں بھی اقتدار و قوت کے مظہر بن بن کر اپنے وجود کو محسوس کرانے لگے۔ علامہ محسن البہاری الترہتی "الیانع" میں لکھتے ہیں :-

لما استولی احمد الابدالی المعروف بالدرانی احد الملوک جبال الافاغنة علے دهلی وکثر فی سککها جماعات من قومه و اکثرهم من شعراء ات	جب احمد شاہ ابدالی جو درانی کے لقب سے مشہور ہیں۔ اور افغانی کوہستانوں کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہیں ان کا تسلط دہلی پر ہو گیا اور دلی کی گلیوں میں بکثرت ان کی قوم کے لوگ بھر گئے۔ اور یہ لوگ قبیلہ کلب

غنم کلب۔ کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ
تعداد میں تھے۔

اسی کا ذکر تھا کہ بریلی میں حافظ الملک رحمت خاں، نجیب آباد میں نجیب الدولہ اور ان کے سوا اور بھی دوسرے دوسرے مقامات میں روہیلوں کی چھوٹی بڑی ریاستیں قائم ہوگئیں حتیٰ کہ اس وقت تک رامپور، ٹونک، بھوپال ان ہی روہیلوں کی یادگاریں نیم آزاد ریاستوں کی صورت میں موجود ہیں۔ بہرحال نادرشاہ نے دشمن بن کر اور شاہ ابدالی نے دوست بن کر ان روہیلوں کو ہندوستان خصوصاً بالائی علاقوں میں بھر دیا۔ ظاہر ہے کہ روہیلے عموماً صرف سنی مسلمان ہی نہیں بلکہ پکے حنفی بھی ہوتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ یہ اپنے اندر چند مخصوص قومی خصوصیات رکھتے تھے۔ جن کی وجہ سے یہاں دونوں قدیم عناصر تورانی و ایرانی سے الگ نظر آتے تھے۔ اور مختلف وجوہ و اسباب

ط انگریزوں کے تسلط کے بعد سنبھل کے ایک پٹھان میر خان نے اسی "اکثر حصی من شعرات غنم کلب" کے لوگوں کو جمع کرکے جن میں مختلف امراء کے تحلیل یافتہ فوج کے سپاہی بھی شریک ہو گئے تھے مختلف علاقوں خصوصاً راجپوتانہ مالی کی ریاستوں پر چھاپہ مارنا شروع کیا۔ آخر میر خاں سے انگریزوں نے ایک معاہدہ کر لیا اور راجپوتانہ مالوہ کی ریاستوں سے اضلاع کاٹ کاٹ کر ایک ریاست بنا دی گئی جن کا مرکز حکومت ٹونک ہے۔ جاورہ کی ریاست بھی میر خاں ہی کے ایک رفیق عبدالغفور خاں کو حاصل ہوئی۔ ۱۲۔

نے ایک حد تک ان کو ایک الگ عنصر کی حیثیت سے ملک میں قائم کر دیا تھا خصوصاً ان کے مزاج میں فطرتاً جو ایک قسم کی سختی اور کرختگی پائی جاتی ہے جو نہ ایرانیوں میں تھی اور نہ تورانیوں میں، اور اسی کے ساتھ باوجود سنی مسلمان ہونے کے تورانیوں اور ان میں ایک نمایاں فرق یہ تھا جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ تورانی زیادہ تر صوفی مشرب اور حضرات صوفیائے کرام و اولیائے عظام کے زیر اثر تھے۔ ان کے برخلاف روہیلے مسلمانوں پر بجائے صوفیوں اور ارباب باطن زیادہ تر تنگ نظر ظاہر بین "جزئیائی فقہا" کا پنجہ سختی سے جما ہوا تھا۔ پشتہا پشت سے وہ اپنے اُن ہی مذہبی پیشواؤں کے زیر اثر جنہیں یہ مُلّا کہتے ہیں زندگی گزار رہے تھے۔ صاحب الیانع الجنی لکھتے ہیں:۔

وکانوا اشد قوم عصبیۃ لما یتخلونہ من آراء فقہائہم رحمہم اللّٰہ تعالٰی	جن فقہاء رحمہم اللہ کی آراء کی پیروی کو ان لوگوں نے اپنا مشرب اور مسلک قرار دیا تھا۔ ان کے معاملہ میں اپنے اندر سخت تعصب رکھتے

سلہ اس وقت کتاب تو میرے سامنے نہیں ہے لیکن نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مدظلہ العالی نے ظہیر الدین بابر پر جو مقالہ لکھا ہے۔ اس میں بابر کے باپ کا ایک واقعہ درج ہے کہ حضرت عبیداللہ احرار کی مجلس میں ایک دن حاضر ہوا۔ اور نوکیلی ہڈی پر اتفاق سے بیٹھ گیا۔ گھٹنوں پر ہڈی چبھتی رہی لیکن ادباً اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ ۱۲۔

واشد الناس جمودا علیھا۔	ہیں اور اس پیچھے رہنے میں رہ جیلے سنت ترین قوموں میں ہیں

یہ تو بیچارے کسی شاعر نے شاعری کی ہے۔ کہ اس کے معشوق کی محفل میں ——" بات پر' یاں زبان کٹتی ہے"۔

لیکن اس قوم کا یہ واقعہ ہے کہ کیا ان جیسی معمولی کتاب کی ایک فقہی روایت لیعنی "چاہیئے کہ تشہد میں اہل حدیث کے مانند شہادت کی انگلی نمازی نہ اٹھائے"۔ اس مسئلہ نے صدیوں ملکر سنتے ہیں کہ اب تک یہ اہمیت حاصل کرلی ہے کہ اگر اتفاقاً نماز میں کسی کی انگلی اٹھ گئی۔ اسی وقت اس کی انگلی تراش دی جاتی تھی۔ علامہ رشید رضا مصری نے مغنی کے مقدمہ میں اپنا یہ بیان درج کیا ہے کہ :۔

سمعته باذن من بعض طلاب الافغانیین فی مسجد لاھور الجامع فی ھند وقد سالتھم عن صحته ما نقل عن بعض بلاد ھم فی ذالك فقالوا النعم وعللوہ بانه عقاب علی مخالفة الرسول وترك سنة	میں نے اپنے کان سے بعض افغانی طلبہ سے لاہور کی جامع مسجد میں جو ہندوستان میں واقع ہے یہ سنا ہے میں نے دراصل اُن سے دریافت کیا تھا کہ انگلی تراشنے کا قصہ کیا صحیح ہے؟ اس کے جواب میں ہاں کہا اور اس کی توجیہہ یہ کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور ترک سنت کی یہ سزا دی جاتی ہے۔

تمباکو جیسی غیر منصوص چیز کی حرمت و حلت پر جو جھگڑا یہاں کے علاقوں میں چھڑا سنا جاتا ہے کہ پچھلے چند سالوں تک یہ قصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ بیچارے کوٹہ ملا نے تمباکو کی حلت کا فتوی دے دیا تھا۔ پھر کیا تھا۔ مختلف جرگوں کے "مجاہد" دینی حمیت و غیرت کے نشہ میں چور اپنے ملاؤں کے زیر کمان باضابطہ مسلح ہو ہو کر کوٹہ ملا پر چڑھ دوڑے۔ راستہ میں اس "دینی جہاد" کی مہم پر جو رجز پڑھا جاتا تھا۔ میرے ایک دوست نے ہم سے بیان کیا تھا کہ وہ یہ تھا۔

کوٹہ ملا کا پردی جو ساک شدہ ہم کا پرہ دی

(یعنی، کوٹہ ملا کافر ہے اور جو اس کے ساتھ ہے وہ بھی کافر ہے!)

میرے ایک اور سرحدی ہم سبق کہتے ہیں۔ کہ تمباکو کی حرمت کے جو لوگ قائل تھے اُن کا تشدد اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ جس کھیت میں تمباکو بویا جائے اس کھیت کے اطراف سے بیلوں پر غلہ لاد کر جو کوئی گزرے گا۔ اس کا غلہ بھی حرام ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس قوم کے اسی فطری "تعطش شدید" اور "ملا کیشی" کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور مغل حکومت جس میں ایرانی و تورانی اب تک گونہ رواداری اور باہمی ملاپ کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ اس میں روہیلوں کی شدید ملایانہ ذہنیت نے بتدریج تلخی اور تندی کا اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ واقعی طور پر سرحدی پٹھان یا روہیلے نہ کبھی خارجی تھے نہ کبھی ہوئے اور نہ اب تک ہیں۔ لیکن ان کی "صوفیانہ سنیت" نہیں بلکہ شدید ملایانہ "سنیت" کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے

کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ جیسے بزرگ جو آج تک شیعوں میں اپنی مشہور کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" کی وجہ سے بدنام اور حد سے زیادہ بدنام ہیں. جس دن سے یہ کتاب لکھی گئی ہے. نہ صرف ہندوستان بلکہ سنا گیا ہے کہ ایران میں بھی اُس کے جواب دینے کی بارہا کوشش کی گئی. لکھنؤ کے مجتہد مولوی سیّد محمد صاحب کے متعلق معتبر لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے بہت سی جلدوں میں اس کا جواب لکھا ہے اور بھی بہت سے چوٹی کے مجتہدوں نے اس کے جواب لکھنے کی کوشش کی اور آج تک یہ کوششیں ہو رہی ہیں —— بہرکیف شاہ صاحب کا سنیت کی حمایت میں جو شہرہ ہے وہ محتاج بیان نہیں. لیکن خود شاہ عبدالعزیز صاحب اپنا ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روہیلہ پٹھان جن کا نام حافظ آفتاب تھا اور شاہ صاحب کے وہ شاگرد تھے "وہمیشہ حاضر درس می شد" فرماتے ہیں کہ

روزے ذکر حضرت امیر علیہ السلام بود چنانچہ عادت ماسنیاں است کہ ہر صحابی کہ اند بجان و دل مناقب و فضائل او بیان می کنم، ہمچنین کردم۔

ایک دن حضرت امیر علیہ السلام کا تذکرہ تھا. پھر جیسا کہ سنی لوگوں کی عادت ہے کہ جو صحابی بھی ہوں دل و جان سے ان کے فضائل اور مناقب کو بیان کرتے ہیں حسب دستور اس تذکرہ میں بھی میں نے یہی کیا۔

لیکن شاہ صاحب کے اس روزانہ حاضر باش روہیلہ تلمیذ رشید کا

حال سنیئے۔ کہ محض اس لئے کہ حضرت کرم اللہ وجہٗ کے ساتھ اس وقت شاہ صاحب نے دوسرے اصحاب و خلفاء کے مناقب و محامد کا چونکہ ذکر نہیں فرمایا تھا اسی لئے باوجود سنّی ہونے کے اور کسی کو نہیں بلکہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بے تحاشہ اُس نے "شیعہ" ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ خود شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ :۔

بندہ را شیعہ فہمیدہ	بندے کو اس نے شیعہ سمجھ لیا۔

اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کی "ملائی سنیّت" نے شاہ صاحب کی جانب سے ایسی شدید نفرت اُس کے دل میں پیدا کر دی کہ

آمدن درس موقوف کرد	کہ درس میں آنا بھی اُس نے بند کر دیا۔

یہ فتویٰ تو "تحفہ اثنا عشریہ" کے مصنف پر اس روہیلہ پٹھان نے لگایا۔ "ازالۃ الخفاء" اور "قرۃ العینین" وغیرہ کتابوں کے مصنف حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کے "ناوک تعصب" سے محفوظ نہ رہ سکے شاہ عبدالعزیز صاحب ہی کی روایت ہے فرماتے ہیں :۔

ہم چنیں شخصے از والد ماجد مسئلہ تکفیر شیعی پرسید انحضرت اختلاف حنفیہ کہ دریں باب ست بیان کردند۔	یوں ہی ایک شخص نے والد ماجد سے شیعوں کے کافر قرار دینے کے متعلق فتویٰ پوچھا۔ حنفی فقہاء کا اس باب میں جو اختلاف ہے (والد ماجد نے) اس کو بیان فرمایا

"ملا کیش" غریب روہیلہ پہلی دفعہ تو یہ سن کر چپ ہو رہا۔ اور پھر

دُہرا کر ذرا اصرار سے اپنے منشاء کو ظاہر کرتے ہوئے

چوں مکرر پرسید ہماں شنید۔	جب اس نے دوبارہ وہی بات پوچھی تو جواب میں پھر وہی سنا۔

دوسری دفعہ اس کا یہ سننا تھا کہ آگ بگولا ہو گیا۔ جن کو وہ قطعی کافر سمجھتا تھا۔ ان کے کفر کے متعلق اختلاف کا سننا اور دوبارہ پوچھنے کے بعد بھی سننا ناقابل برداشت ہو گیا۔ "گیا تھا خود حضرت سے فتوے پوچھنے۔ لیکن الٹ کر خود مفتی بن بیٹھا۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ:۔

شنیدم می گفت ایں شیعی ست۔	میں نے سنا وہ کہتا تھا کہ یہ (یعنی شاہ ولی اللہ) شیعی ہے۔

اور یہ حالت تو ہمارے سرحدی اور افغانی بھائیوں کی "سنیت" کی تھی۔ باقی رہی اُن کی "حنفیت" سو اس کا کچھ اندازہ "رفع سبابہ" اور "بھناک" کے مذکورۂ بالا مسائل ہی سے ہو سکتا ہے۔ الیانع الجنی" کے مؤلف تحریر نے حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ کے ان حنفی روہیلوں کی "حنفیت صلبہ" یا سنگین ملّایانہ حنفیت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

فکانوا اذا قرع صماخهم ما ینا بذ مقلدهم الذی اصطلحوا علیہ کان احدهم یکاد یسطو	اُن کا حال یہ تھا کہ جب اُن کے کان میں کوئی ایسی بات پہنچتی۔ جو ان کے اس تقلیدی امر کے خلاف ہوتی جسے کل وہ اچھا سمجھتے تھے تو ان

بالذی خرجت منہ	میں جو کوئی ہو۔ قریب ہوتا کہ
القولۃ وامتلاوعلیہ	اُس شخص پر چڑھ بیٹھے جس کے
غیظاً قد انتفخت او	منہ سے ایسی مخالف بات نکلی ہوتی
داجہ واحمرت وجنتاہ	غصہ سے اس کے مقابلہ میں بھر جاتا
کانھما ضرام العرفج ص۴۳	اُس کی گردن کی رگیں پھول جاتیں
	اُس کے رخسارے سرخ ہو جاتے

اور ایسا معلوم ہوتا کہ جھاؤ کی لکڑی کے انگارے ہیں۔

ہندوستان میں رہ پڑنے کے بعد اگرچہ اب ان کی پچھلی نسلوں میں نسبتاً وہ کرختگی اور تصلب تو باقی نہیں رہا ہے جس میں کچھ تو اس ملک کی آب و ہوا کا اثر ہے۔ نیز اس کے سوا اور اسباب بھی ہیں جن کا کچھ ذکر شائد آئندہ آئے ورنہ جو اب تک ان ہی پتھریلے کوہستانوں میں رہتے ہیں۔ ان کی دینی سختی کا حال جیسا کہ سید رشید رضا مصری نے لکھا ہے وہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

ومن ذلک ان لبعض	ان کی سختیوں کی داستانوں میں
الحنفیۃ من الافغانیین	ایک قصہ یہ ہے جو بعض افغانی
سمع رجلاً یقرءالفاتحۃ	حنفیوں کے متعلق سنا جاتا ہے کہ
وھو بجانبہ فی الصف فضربہ	اس نے جماعت میں اپنے برابر
بجموع یدہ علے	والے کو دیکھا کہ وہ سورۃ فاتحہ
صدرہ ضربۃ	(امام کے پیچھے) پڑھ رہا ہے تو اس

وقع بها على ظهره فكاد يموت فبلغني ان بعضهم كسر سبابة مصل لرفعه اياها في التشهد۔ (ص ۱۶ مقدمہ مغنی)

افغانی نے اس بیچارے فاتحہ پڑھنے والے کے بیٹنے پر اس زور سے دو ہتڑ مارا کہ وہ بیچارہ پیٹھ کے بل زمین پر گر پڑا اور قریب تھا کہ مر جائے اور مجھے یہ خبر بھی ملی ہے کہ ایسے ہی ایک شخص نے تشہد کی انگلی نماز میں اٹھائی تو بعض افغانوں نے اس کی انگلی توڑ دی۔

بہرحال فتنوں والی تاریک راتوں کی جس "خونی موج کے آغوش" اور اسلامی ہند کے شدید طوفانی عہد کے ذکر کو میں نے ناصیۂ مضمون پر ثبت کیا ہے۔ غالباً اہل نظر کے سامنے اگرچہ جیسا کہ چاہیئے۔ میں کوئی تفصیلی بیان نہ پیش کر سکا۔ لیکن ایک مجلاتی مقالہ میں اس تصویر کے جتنے خط و خال کو نمایاں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے محدود معلومات اور کوتاہ رسائی کی حد تک ممکنہ کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے سچی بات یہی ہے کہ اس "دُرِ تابندہ" کی حقیقی قدر و قیمت قطعاً نہیں پہچانی جا سکتی۔ جس نے ابتلاء و امتحان کی اُن ہی خونی موجوں میں پرورش پائی اور طوفان کے اُن ہی ہنگاموں میں انتہائی دانائی و فرزانگی کے ساتھ وہی جس کی محبت میں وہ ہر چیز کی محبت سے دست بردار ہو چکا تھا۔ اسی کی ملت مقدسہ اور سامت مرحومہ کی کشتی کو اپنی وسعت و طاقت کی حد تک منجدھار سے نکالنے میں قطعاً کامیاب ہُوا۔

(وصلی اللہ تعالیٰ علی نبینا و نبیہٖ و رسولنا و رسولہٖ وجزاہ اللہ عنا وعن امتہ نبتہ خیرالجزا)

یہاں تک کہ تاریخی مباحث کا مقصد اور حاصل

میرا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ بالا اوراق کے پڑھنے والے اب صحیح طور پر اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ جس زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اور جن دنوں میں وہ سرزمین ہند میں زندگی گزار رہے تھے۔ اُس وقت ہر چار طرف سے اسلام نرغہ میں گھرا چلا جاتا تھا۔ شمالی مغربی علاقوں میں سکھوں کی آتشیں قوت سر اٹھا رہی تھی۔ جنوبی ہند سے مرہٹوں کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا ملک کے "اعزہ" کو "اذلہ" بنانے میں بے دردی سے سرگرم تھا دونوں قوتوں میں باہم جو کچھ بھی اختلاف ہو لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مآثر و نشانات اُن کے نام لیووں اور وابستوں حلقہ بگوشوں کا بالکلیہ قلع قمع کرنے پر دونوں ادھار کھائے بیٹھے تھے تیسری طرف خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے مغربی قوتیں بتدریج اپنا پنجہ ملک پر جماتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اور یہ تو بیرونی فتنے تھے اندرا ایرانیوں اور تورانیوں پھر اُن کے ساتھ روہیلوں کے باہمی تصادم اور مختلف اغراض و مقاصد کی کش مکش سے "اسلامی حکومت ہند" کی قبا تار تار ہو رہی تھی۔ اُن سیاسی مفاسد کے ساتھ ساتھ صوفیا کے غلط تصوف اور فقہا کے غلط تفقہ، حد سے گزری ہوئی عصبیت اور جاہلیت نے امت کے

شیرازوں میں الگ انتشار پیدا کر رکھا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایرانی علماء اور شعراء و ادباء کا جو دباؤ مختلف وجوہ سے ہندوستانی علماً ارباب فکر و نظر اور تعلیم و تدریس و تصنیف و تالیف کے نظام پر پڑ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے آہستہ آہستہ یہاں کے اہل علم کا تعلق قرآن وحدیث تحقیق فقہ و اصول فقہ اور عقائد و کلام سے ہٹ کر بے معنی لاطائل ذہنی اور لفظی مباحث کے گورکھ دہندوں میں اُلجھا اُلجھ کر "خسرالدنیا والآخرہ" کی صورت پیدا کر رہا تھا کہ ان لاحاصل مساعی کا کوئی نتیجہ نہ اُن کو دنیا میں مل سکتا تھا نہ آخرت میں، خصوصاً ایک ایسے زمانہ میں جب "مغل دربار" اور مغل دربار کے امراء جو ان لفظی نکتہ نوازیوں اور دماغی عیاشیوں کے قدردان تھے اور ان سے گونہ محظوظ بھی ہوتے تھے۔ خود ان غریبوں کا اقتدار ہی اندر اندر کھوکھلا ہوتا چلا جا رہا تھا اُن کے تختے خود ہی الٹ رہے تھے پھر وہ بیچارے دوسروں کی قدردانی کیا کرتے۔ اور ملک میں جو نئی قوتیں ابھر رہی تھیں۔ ان کے سامنے ان ایرانی نژاد لفظی کج بحثیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

غالباً ان حالات کو سب دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ سبھوں کے سامنے گزر رہا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جو کچھ انجام ہونے والا تھا وہ مشکل ہی سے کسی کو سوجھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنے عقل و حواس کو معطل کر کے ہر ایک اسی دھارے پر بہا چلا جا رہا تھا۔ جدھر زمانہ کے تھپیڑے انہیں بہائے لئے جا رہے تھے۔ لیکن حیرت نہ

کرنی چاہیئے خصوصاً اسلامی تاریخ مطالعہ کرنے والوں کو ششدر نہ ہونا چاہیئے کہ پہلی دفعہ نہیں بلکہ تیرہ سو سال سے اسلامی حدود کے جس علاقہ میں اس قسم کے واقعات پیدا ہوتے ہیں۔ تو کائنات کی وہی آخری قوت جس کے پیغام کا نام اسلام ہے اور جس پر خدا نے اپنی پیام بری کے سلسلوں کو ہمیشہ کے لئے مختتم فرمایا ہے۔ اسی کا کوئی معجزہ ضرور ایسے وقت میں ظاہر ہوتا ہے اور ان منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے جو دشمن اپنے دلوں میں سوچا کرتے تھے اور جن کا خیال کر کر کے ایمان والے سہمے جاتے تھے۔ یہی واقعہ ہندوستان میں بھی پیش آیا۔

فتنوں کے اس دور میں شاہ ولی اللہ کی آمد

ایک ایسے باب سے جو مشرباً صوفی اور تعلیماً مشہور معقولی و منطقی عالم میرزاہد ہروی صاحب "زواہد ثلثہ"[1] کے رشید شاگردوں میں تھے اور کیسے رشید شاگرد کہ شاہ ولی اللہ نے خود اپنے

---

[1] تقریباً دو ڈھائی سو سال سے اس ہراتی ہندی عالم کی تین کتابیں ہندوستان بخارا، کابل وغیرہ کے مدارس میں داخل نصاب ہیں۔ ان کتابوں کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ عالم ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ میرزاہد کی کتابوں میں سے کسی ایک پر یا سب پر کوئی حاشیہ نہ رکھتا ہو۔ مبالغہ نہیں ہے کہ ان تین کتابوں کے حواشی کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہوئی ہوگی۔ ہندوستان دراصل میرزاہد کے والد قاضی اسلم ہرات سے عہد جہانگیر میں آئے۔ بادشاہ نے قاضی القضاۃ کے عہدہ پر قاضی اسلم کا تقرر کر دیا تھا قاضی اسلم ملا فاضل کے اور وہ میرزا جان شیرازی مشہور منطقی عالم کے شاگرد تھے۔

(باقی ص ۲۰۵ پر)

والد کی زبانی نقل کیا ہے۔ کہ ایشاں با من التفات بسیار مے کردند بحدے کہ اگر مے گفتم کہ

امروز مطالعہ نہ کردہ ام مے گفتند۔ یک سطر یا دو سطر بخوانید کہ ناغہ نشود (انفاس ص۲۰۳)	مرزا زاہد کی توجہ میری طرف اس حد تک مبذول تھی کہ میں کہتا کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا اس لئے نہیں پڑھونگا

تو مرزا کہتے کہ ایک یا دو سطر ہی پڑھ لو۔ تاکہ ناغہ تو نہ ہو۔

میرزا زاہد کی سب سے بڑی معرکۃ الآرا تصنیف حواشی امور عامہ شرح مواقف کے متعلق شاہ ولی اللہ کا بیان ہے:۔

ظاہرا تسوید حاشیہ شرح مواقف بہ تقریب قرأۃ حضرت ایشاں بود	حاشیہ شرح مواقف کی مسودہ نگاری کا کام میرزا نے اسی سلسلہ میں کیا جب والد اُن سے یہ کتاب پڑھتے تھے۔

(بقیہ ص۲۰۴) بہرحال انہی قاضی اسلم کے صاحبزادے کا نام میرزا زاہد ہے معلوم نہیں کہ عام مدارس میں بجائے میرزا زاہد کے میر زاہد کیسے مشہور ہو گیا غالباً یہ تصحیف غلطی ہے۔ یا لوگوں نے اس غلطی پر دوسری غلطی یہ کی کہ "قال السید الزاہد" اور "قال السید السند" وغیرہ لکھنا شروع کیا۔ میرزا زاہد بچپن ہی سے بڑے ذہین تھے کل تیرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے عالمگیر کے زمانہ میں مختلف خدمتوں پر بحال ہوئے۔ شاہ عبدالرحیم جس زمانہ میں ان سے پڑھتے تھے۔ آگرہ میں فوج کے محتسب تھے علاوہ زواہد ثلثہ کے میر زاہد کا ایک حاشیہ شرح تجرید پر بھی ہے اور اشراقیوں کی کتاب "ہیاکل النور" پر بھی ایک شرح لکھی ہے شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے "از مشرب صافی صوفیہ غیر بہرہ تمام داشتہ اند۔"

بہر حال اسی معقولی فلسفی کے ایک صوفی شاگرد کے صلب مبارک سے حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے بڑے سخت وقت اور کٹھن گھڑی میں ہندی مسلمانوں کو وہ گرامی ہستی عطا فرمائی۔ جس کا نام

حضرت سیدنا الامام مولنا الشاہ ولی اللہ دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز ہے

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم کی شخصیت

اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ جو کچھ ہونے والے تھے اور ہندوستان میں جس دینی و علمی موسم کو ان کی مخلصانہ کوششوں نے پیدا کیا۔ اس موسم کی بہار کی ابتدا خود ان کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم ؒ سے ہو چکی تھی۔ پہلی بازی جو شاہ عبدالرحیم نے جیتی وہ اس وقت کی بات ہے جب وہ طالب علم تھے اور فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ہو رہی تھی۔ ان کے ایک ساتھی جن کا نام شیخ حامد تھا۔ اُن کو بھی کام کا کچھ حصہ دفتر تدوین سے عطا ہوا تھا براہ محبت و دوستی شیخ حامد نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو شریک کار کر کے کچھ یومیہ (تنخواہ) کی امید دلائی لیکن جو کسی آنے والے سال نکو کی بہار تھا۔ اس نے ملتی ہوئی تنخواہ سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی خبر جب شاہ عبدالرحیم کی بیوہ والدہ کو ہوئی تو برہم ہوئیں اور اصرار کر کے حکماً نوکری قبول کرنے پر مجبور کیا تو نوکر ہو گئے مگر جب اس ملازمت کی خبر آپ کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کو ہوئی تو آپ بہ برہم ہوئے۔ اور ترک ملازمت پر تدغن شروع کیا۔ شاہ صاحب نے والدہ کے حکم کا عذر پیش کیا۔ لیکن ”پیر“ نے اپنے حکم کی پیروی کا فیصلہ صادر

فرمایا پھسل جانے کا شاید موقعہ تھا لیکن شاہ عبدالرحیم سنبھل گئے۔ اور مرشد سے عرض کیا کہ آپ ہی دعا فرماویں کہ نوکری چھوٹ جائے ورنہ لوں چھوڑونگا تو والدہ کی سخت آزردگی کا اندیشہ ہے حصول ملازمت کے لئے نہیں بلکہ ترک ملازمت کی دعا کرائی گئی اور کی گئی قبول ہوئی. عالمگیر کے پاس تدوین فتاویٰ کے ملازموں کی فہرست وقتاً فوقتاً پیش ہوتی رہتی تھی حسب دستور پیشی کا عالمگیر نے حکم دیا۔ اور بلا وجہ شاہ عبدالرحیم کے نام پر قلم پھیر دیا۔ مگر ابھی امتحان کی ایک منزل باقی تھی اورنگ زیب نے تنخواہ بند کرکے اس سے بھی بڑا لقمہ پیش کیا۔ فرمان ہوا کہ :-

گرخواستہ باشد۔ ایں قدر زمین بدہید۔ — اگر چاہیں تو اتنی زمین اُن کو دی جائے

نوکری چھوٹی، جاگیردار بنائے گئے۔ قدرت، جس کا ارادہ کچھ اور تھا اس کی توفیق نے پھر اُن کے بازو تھام لئے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب سے "شاہی فرمان" کے بموجب جب استصواب کیا گیا تو باوجود تنگی معاش اور معنی بے وسیلہ ہونے کے خود فرماتے ہیں :-

قبول نہ کردم وشکرانہ بجا آوردم وحمد خدا تعالیٰ گفتم — مَیں نے قبول نہیں کیا اور شکر ادا کیا۔ اور حق تعالیٰ کی حمد کی۔

لہ شاہ عبدالرحیم کے اس قول سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اور آپ کے خاندان والوں کو جیسا کہ اس زمانہ کا عام دستور تھا۔ حکومت سے کسی قسم کی کوئی جاگیر منصب، وظیفہ، مدد معاش وغیرہ نہیں ملی تھی۔ شاہ ولی اللہ کے متعلق (باقی صفحہ

نوکری چھوٹی، جاگیر سے محروم ہوئے۔ لیکن اس پر بھی "محمد خدا تعالیٰ گفتم" جس کا یہ مقام ہو۔ اگر اس کا اور اس کی ذریت طیبہ کا قدرت کسی اہم خدمت کے لئے انتخاب کرے۔ تو

لئن شکرتم لازیدنکم — اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں بڑھاتا چلا جاؤں گا۔

کے وثیقۂ محکمہ اور وعدہ مؤکدہ والے سے اور کس بات کی توقع کی جا سکتی تھی

(بقیہ صفحہ ۲۰۷) میں نے بہت تلاش کیا۔ بجز اس حویلی کے جو مدرسہ کے لئے محمد شاہ بادشاہ نے آپ کو پیش کی تھی اور کسی حکومتی امداد کا پتہ نہیں چلا۔ شاہ عبدالرحیم تک تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خاندان میں قدیم سے طبابت کا پیشہ چلا آتا تھا لیکن جیسا کہ شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات میں ہے:۔

"حکمت ہم درخاندان ما معمول بود۔ چنانچہ جد بزرگوار و عم فقیر مداومی کردند والد ماجد بندہ موقوف ساختہ" صفحہ ۲۲۔

شاہ ولی اللہ کے بعد بھی خاندان میں کوئی جاگیر وغیرہ آئی۔ اس کے متعلق صرف مرحوم امیر شاہ خاں صاحب کی امیر الروایات میں ایک روایت ہے کہ ضلع بلند شہر تحصیل سکندرہ میں حسن پور نامی ایک گاؤں اس خاندان کا تھا۔ امیر شاہ خاں نے اس گاؤں کو خود بھی دیکھا ہے فرماتے تھے۔ کہ اچھا خاصہ بڑا گاؤں ہے۔ ان ہی خان صاحب کا بیان ہے کہ عموماً مالگزاری وغیرہ وصول کرنے کے لئے مولانا اسمٰعیل شہید جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مولوی موسیٰ بن مولانا رفیع الدین بھی گئے تھے امیر الروایات میں دوسری جگہ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "انگریزی عہد میں شاہ اسحاق و

زیادہ تو نہیں لیکن اتنا حال تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس امتحان سے کامیاب ہونے کے بعد شاہ عبدالرحیم کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم جو آگرہ میں رہتے تھے اور شاہ صاحب بھی ان دنوں آگرہ ہی میں تھے خلیفہ صاحب

(بقیہ صفحہ گزشتہ) شاہ یعقوب سے حکومت نے یہ جاگیر ضبط کر لی. بیان کیا جاتا ہے کہ اس دن دونوں بھائی جتنے مسرور دیکھے گئے کبھی اس حال میں لوگوں نے آپ کو نہیں پایا تھا". بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گاؤں غالباً شاہ عبدالعزیز کے زمانہ میں کسی ذریعہ سے اس خاندان میں آیا تھا ورنہ اس سے پیشتران حضرات کا معاشی ذریعہ وہی توکل تھا جو سلفاً عن خلف عموماً اہل اللہ کا مدار رہا ہے۔ اگرچہ ادھر کچھ دنوں سے مغرب زدوں کے فقروں سے تنگ آکر لوگوں میں اس سے گونہ کراہیت پیدا ہوتی چلی جارہی ہے تائید میں صحابۂ کرام کو پیش کیا جاتا ہے جن کی ظاہر ہے کہ حیثیت مریدوں کی تھی لیکن مشائخ و اکابر صوفیہ جس ذات گرامی کی نمائندگی کرتے ہیں سوال اُن کے متعلق ہے کہ نبوت کے بعد اور فتوحات سے پہلے درمیانی زندگی حضور کی جو گزاری کیا اس کے لئے آپ نے کوئی کسب اختیار فرمایا تھا اصل یہ ہے کہ مشائخ ان فتوحات سے دینی مہمات میں کام لیتے تھے اب اگر کوئی ان کو اپنے لذائذ نفسانی پر صرف خرچ کرتا ہے تو اس کا وہ خود ذمہ دار ہے لیکن بعض اس غلط استعمال کی وجہ سے فتوحات مشائخ کے عدم جواز کا فتویٰ صادر کرنا کیا صحیح ہو سکتا ہے کچھ بھی ہو میرے نزدیک تو اس زمانہ کی چندہ بازیوں اور اس کی خواریوں سے پہلے زمانہ کی فتوحات سازیوں کی عزت بہرحال بہتر تھی چندہ گریڈروں کی ریس میں جو مولوی یا مشائخ فتوحات سے کارہ ہیں۔ أتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ۱۲ منہ۔

شاہ صاحب کو حکم دیا کہ شاہ عظمت اللہ نامی بزرگ کے پاس جاکر حاضری دو جو سلسلہ طریقہ چشتیہ کے ایک کہنہ سال معمر ترین بزرگ اس زمانہ میں آگرہ میں تھے۔ مرشد کے بار بار اصرار کے بعد آخر ایک دن شاہ عبدالرحیم، عظمت اللہ شاہ صاحب کے پاس حاضر ہوئے وہ بیمار تھے۔ پلنگ پہ لیٹے لیٹے باتیں کرتے رہے سلسلۂ گفتگو میں شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنا خاندانی تعلق "شیخ عبدالعزیز شکر بار" سے ظاہر کیا

لہ انفاس میں ہے کہ "ایشاں جدّ اعلیٰ حضرت والد بزرگوار اند از جہت والدہ ایشاں" یعنی یہ شاہ عبدالرحیم کے نانا تھے۔ شیخ عبدالعزیز کے والد کا نام حسن تھا۔ حسن کے والد کا نام طاہر تھا۔ شیخ طاہر اگرچہ اچھے ملتان کے رہنے والے تھے لیکن شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "ناحیۂ پورب اقامت گاہ ایشاں شد"۔ پورب سے کیا مراد ہے صاف طور سے معلوم نہ ہوسکا البتہ شیخ طاہر کی تعلیم اور شادی کا ذکر فرماتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے۔ کہ تحصیل علم ایشاں بر بلدۂ بہار کہ مجمع علماء بود" میں ہوئی اور "بعد فراغت قاضی بہار صبیہ خود ایشاں را داد"۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ "شیخ طاہر از ملتان بطلب علم باین دیار افتادہ مدتے در بلدہ بہار سکونت کردہ پیش شیخ مدہ حقانی تحصیل علم نمودہ ہم در بہار شیخ حسن از خلوت خانہ عدم بہ مہمان سرائے وجود رسید" صفحہ ۱۹۵۔ جس کے یہی معنے ہوئے کہ شاہ عبدالرحیم کے نانا کے والد بہار ہی میں پیدا ہوئے تھے اور غالباً "قاضی بہار" جس کی لڑکی سے شیخ طاہر کی شادی ہوئی وہ یہی شیخ مدہ حقانی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ۱۲

آخر میں شیخ عبدالعزیز اپنے مرشد قاضی خاں ظفر آبادی کے حکم سے دلی آئے اور مرسس قوانین ارشاد گشت"۔ ۱۲

معاً عظمت اللہ شاہ صاحب سے یہ سنتے ہی پلنگ سے زمین پر آ گئے اور شاہ عبدالرحیم کو گلے سے لگایا۔ پھر ایک سوال کیا۔ جواب پایا۔ اس کے بعد شاہ عظمت اللہ صاحب نے یہ قصہ کہنا شروع کیا کہ "میرے دادا صاحب کو شیخ عبدالعزیز شکر بار نے وصیت فرمائی تھی اور کچھ تبرکات دئے تھے اور کہا تھا کہ میری اولاد میں سے اگر کوئی تمہارے پاس آکر فلاں سوال کا فلاں جواب دے تو میرے یہ تبرکات اس تک پہنچا دینا یہ تبرکات دادا کے زمانہ سے اس وقت تک اسی وصیت کے ساتھ محفوظ چلے آرہے ہیں۔ شاہ عظمت اللہ نے فرمایا کہ چونکہ سوال کا جواب تم نے دے دیا اسلئے وصیت کرنے کا وقت آگیا۔ یہ کہہ کر شاہ عبدالرحیم کے سر پر انہوں نے عمامہ باندھا اور اپنے طریقہ کی اجازت بھی عطا فرمائی۔ جب چلنے لگے تو کچھ مٹھائی اور نقد روپے بھی ساتھ کر دئے شاہ عبدالرحیم صاحب وہاں سے ان سب چیزوں کو لئے ہوئے اپنے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کے پاس پہنچے اور مٹھائی روپے خلیفہ صاحب کے آگے رکھ دئے۔ ماجرا بیان کیا" یہ بشارت قلبی تعلق کرد ند" اور آخر میں خلیفہ ابوالقاسم نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو یہ بشارت سنائی۔

اشارت بر جمعیت ظاہر و عمامہ اشارت بہ اجازت و جمعیت باطن

روپیہ تو ظاہر حال کے اطمینان اور فراخیالی کی طرف اشارہ ہے اور عمامہ باطنی اطمینان اور فراخیالی اور اجازت کا اشارہ ہے۔

اس جمعیت ظاہر کی بشارت کے بعد خود شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ

معاش پراگندگی کا سوال ان کی زندگی میں سرے سے کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ ورنہ "جمعیت باطن کی اس خوشخبری کے بعد انہیں معاشی حیات کے لئے کبھی دشواری اٹھانی پڑی۔" فتوحات" کی یہی شکل کہ دل سے نکل دینے کے بعد آنکھوں کے سامنے آئے تب تو واقعی فتوحات ہیں لیکن جو لوگ بظاہر اُن سے آنکھیں چراتے ہیں۔ لیکن ان کے دلوں میں چوبیس گھنٹے ان ہی فتوحات کے بت براجمان ہیں۔ یقیناً یہ فتوحات نہیں عقوبات ہیں قرآن کی اس آیت کا ایک مصداق اگر یہ "فتوحات" بھی ہوں۔ تو کیا عجب ہے۔

ان کثیرا من الاحبار والرھبان	قطعاً بہت سے احبار (علماء یہود)
لیاکلون اموال الناس	اور رہبان (مشائخ، نصاریٰ)
بالباطل ویصدون	لوگوں کے مال باطل راہ سے کھاتے
عن سبیل اللہ والذین	ہیں اور روکتے ہیں۔ اللہ کی راہ
یکنزون الذھب والفضۃ	سے اور جو سونے چاندی کو سینت
ولا ینفقونھا فی سبیل	سینت کر رکھتے ہیں اور اللہ کی
اللہ فبشرھم بعذاب	راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے
الیم یوم یحمی علیھا فی	ایسے لوگوں کو دکھ بھرے عذاب کی
نار جھنم فتکوی بھا	بشارت سنا دو جس دن تپایا جائیگا۔
جباھھم وجنوبھم	چاندی سونے کو جہنم کی آگ پر
وظھورھم ھذا	پھر داغی جائے گی پیشانی،

ماکنزتم لانفسکم فذوقوا ماکنتم تکنزون۔ — اُن کے پہلو اور اُن کی پیٹھ یہ وہی جو تم نے جمع کیا تھا اپنے لئے پس دیکھو عذاب اس کا جو جمع کیا تم نے

انفاس العارفین اور بعض دوسری کتابوں میں شاہ عبدالرحیم کی جس صاف ستھری زندگی کے پڑھنے سے دل کو راحت ملتی ہے اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ "ولی الٰہی حقیقت" دراصل قدرت کے اسی قانون کا مظہر ہے جو کسی شاعر نے کہا ہے :۔

کذالک تنسام لینۃ ھو جر قعا
وحسن نبات الارض من کرم البذر

شاہ ولی اللہ کی ولادت سے پہلے شاہ عبدالرحیم کو ان کے کمالات کی بشارت

بلکہ شاہ ولی اللہ نے خود بھی اور دوسروں نے بھی لکھا ہے کہ شاہ ولی اور ان کے کمالات و مقالات کی بشارت شاہ عبدالرحیم کو پہلے سے مل چکی تھی۔ ایک واقعہ انفاس العارفین میں درج ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض شاہ ولی اللہ کی ولادت کے لئے شاہ عبدالرحیم نے کسی غیبی اشارہ کے ماتحت ہی ساٹھ سال کی عمر میں دوسری شادی کی تھی بعض لوگوں کو اس پر اعتراض بھی ہوا کہ :۔

دریں عمر کدخدائی مناسب نبود — اس عمر میں شادی مناسب نہ تھی۔

شاہ عبدالرحیم نے سن کر فرمایا۔ کہ :۔

مدتے دراز از عمر من باقیست و فرزندان بوجود خواہند آمد۔

میری عمر کا بڑا حصہ ابھی باقی ہے اور انشاء اللہ چند لڑکے ابھی اور پیدا ہوں گے۔

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس کے بعد والد سترہ سال زندہ رہے اور دو لڑکے حضرت کے تولد ہوئے۔ جن میں ایک خود شاہ صاحب ہیں اسی طرح انفاس ہی میں ہے کہ تہجد کی نماز شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ صاحب کی والدہ پڑھ رہی تھیں۔ نماز کے بعد شاہ عبدالرحیم نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا اور بیوی صاحبہ سے آمین کہنے کے لئے کہا۔ دعا ہو رہی تھی کہ ابھی شاہ ولی اللہ عالم وجود میں نہیں آئے تھے۔ بہر حال عین دعا کی حالت میں

درمیان ایشاناں دُو دست دیگر ظاہر شد۔

ان دونوں کے درمیان میں دو ہاتھ اور ظاہر ہوئے

شاہ عبدالرحیم نے فرمایا کہ ،۔

ایں دُو دست فرزند ما اند

یہ دونوں ہاتھ ہمارے لڑکے کے ہیں۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ سات سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ نماز تہجد میں ٹھیک اسی شکل کے ساتھ دعا کرنے کا موقعہ میسر آیا۔ "وھٰذا تاویل رؤیای قد جعلہ ربی حقاً" ——— شاہ ولی اللہ جس لئے پیدا ہوئے تھے اس کا اشارہ بچپن ہی میں اُن کے والد نے

ایک خاص طرز سے فرما دیا تھا۔ خود ہی لکھتے ہیں :۔

ایں فقیر بہ موافقت احبا رو اقربا، روزے بہ تفرج بوستانے رفت چوں باز آمد حضرت الیشاں فرمودند اے فلانے دریں شبانہ روز چہ حاصل کردی کہ با تو باقی ماند۔	فقیر اپنے دوست احباب اور بعض عزیزوں کے ساتھ ایک دن ایک باغ کی سیر کو گیا جب واپس ہوا تو حضرت (والد) نے فرمایا۔ اے فلاں رات دن میں تم نے کیا چیز حاصل کی جو تمہارے ساتھ باقی رہے گی۔

"چہ حاصل کردی کہ با تو باقی ماند"۔ والد بزرگوار کے سوال کا یہی تیر تھا جو سعادت مند فرزند کے قلب صالح میں جا کر ترازو ہو گیا۔ اور ایسا ترازو ہوا کہ پھر عمر بھر نہ نکلا۔

خود فرماتے ہیں :۔

بمجرد ایں کلام دل فقیر از تفرج بوستانہا سرد شد باز مثل ایں داعیہ بوجود نیامد	بس اتنی بات کے سننے کے ساتھ ہی فقیر کا دل باغوں کے سیر سپاٹے سے سرد ہو گیا۔ پھر کبھی اس قسم کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔

کل اکسٹھ سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ کا محیر العقول کام

اور واقعہ یہ ہے کہ کل اکسٹھ سال کی عمر میں شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ نے "از تو باقی ماند" والے جو کام کئے ہیں کم از کم ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے

لکھنے پڑھنے کے بعد "از تو باقی ماند" کے خدمات کا یہی ذوق تھا جس نے ان کو اس دھارے میں بہتے ہوئے نہ چھوڑا۔ جس میں ان کے ابناء عصر تقریباً ہر طبقہ کے بہہ رہے تھے۔ جس کی وجہ کچھ تو حضرت کے والد کی تربیت تھی۔ ماسواء اس کے شاہ صاحب فطرتاً "رسم عام" کی پابندی سے نفور رہتے تھے۔ حتیٰ کہ آئمہ مجتہدین تک کی تقلید جس پر انہوں نے اپنی مختلف کتابوں میں مختلف حیثیت میں محض خوش اعتقادی کے طور پر نہیں بلکہ تحقیقی نقطۂ نظر سے زور دیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اپنے فطری میلان کا حال بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :۔

وجبلتی تابی التقلید وتانف منہ راسًا (فیوض الحرمین)	تقلید سے میری جبلت اور سرشت انکار کرتی ہے اور بالکلیہ اس سے بھڑکتی ہے۔

مگر وہی آپ کی "نسبت اویسی" اس فطری میلان کے صحیح استعمال میں کام آئی خود فرماتے ہیں کہ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے براہ راست جن امور کی وصیت کی گئی (جن میں سے ایک کا ذکر پہلے کر چکا ہوں) ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ :۔

التقید بھذہ المذاھب الاربعۃ لا اخرج منھا والتوفیق ما استطعت	ان چار مذاہب مروجہ کی تقلید سے کبھی باہر قدم نہ رکھوں اور جہاں تک ممکن ہو سب میں تطبیق کی کوشش کروں۔

پھر شاہ صاحب ترک تقلید کے متعلق اپنے نفسی میلان اور طبعی رجحان کا ذکر کرنے کے بعد اپنی مجبوری کو اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ :۔

ولکن طلب منی التعبد بہ بخلاف نفسی۔	لیکن میں کیا کروں کہ میرے اقتضائے نفسی کے خلاف ان مذاہب اربعہ کی پابندی ہی کا مجھ سے مطالبہ ہے اور اس بارہ میں مجھے سرنیاز جھکا دینے ہی کا حکم ہے۔

آگے چل کر اپنے میلان نفس بسوئے عدم تقلید اور وصیت نبوی دربارۂ اختیار تقلید کے اصل راز کے متعلق صرف اتنا فرماتے ہیں کہ :۔

وھٰھنا نکتۃ طویت ذکرھا وقد تفطنت بحمد اللہ بسر ھٰذہ الجبلۃ وھٰذہ الوصاۃ (فیوض ص ۶۵)	یہاں ایک باریک راز ہے جس کے ذکر کو میں نے بالقصد قلم انداز کر دیا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اپنی فطرت اور آنحضرت ﷺ کی اس وصیت کے اس راز کو میں نے سمجھ لیا ہے۔

جب شاہ صاحب نے ہی اس نکتہ کا ذکر نہیں فرمایا۔ تو میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن اتنی بات تو سمجھ میں آتی ہی ہے کہ آپ کے اس فطری میلان اور طبعی رجحان کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کے سامنے وہ چیزیں مسلسل آتی رہیں جن سے آپ کے معاصرین غافل تھے۔ سب سوئے ہوئے تھے لیکن خدا نے آپ کو بیدار رکھا اسلام اور مسلمانوں کی جو حالت اس ملک میں ہو رہی تھی۔ اس کے تمام پہلوؤں پر آپ کی نظر پہنچی۔ دماغ نے

مخلصی اور نجات کی راہ ڈھونڈنی شروع کی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ کفر کے اس غلبہ واستیلار، اور ارباب حکومت کی خود غرضیوں اور نااہلیوں کو دیکھ کر آپ آستین چڑھا لیتے اور ایک آستین چڑھا کر "الجہاد ثم الجہاد" کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کی کسی جماعت کو اپنے ساتھ لے کر سیاسی کش مکش میں مبتلا ہو جاتے اور جب دنیا کے نام پر مختلف گوشوں سے مختلف قوتیں اپنے گرد لوگوں کو جمع کر رہی تھیں تو دین کے نام پر نیم مردہ مسلمانوں کو بھی کیوں نہ زندہ کیا جا سکتا تھا خصوصاً جب ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شاہ صاحب کا خاندانی تعلق جس قبیلہ اور نسل سے تھا علم وتصوف کے ساتھ اس خاندان کے لوگ فوجی کاروبار میں بھی یگانہ روزگار تھے۔ بلکہ شاہ عبدالرحیم سے پہلے تو شاہ صاحب کے خاندان میں علم وتصوف کی محض ثانوی حیثیت تھی۔ اصلی کام اس خانوادہ کا جہاد ہی تھا۔

(جملہ معترضہ) شاہ صاحب کے جدِ امجد شاہ وجیہ الدین کی تاریخی شجاعت

آپ کے براہ راست جدِ امجد یعنی شیخ وجیہ الدین کے واقعات تو خود شاہ صاحب نے اپنی مختلف کتابوں میں درج کئے ہیں جن کو سن کر حیرت ہوتی ہے

عالمگیر کی فوج جب شاہ شجاع سے نبرد آزما ہوئی۔ اور شجاع نے ہاتھیوں سے حملہ کیا تو شاہ صاحب کے ان دادا ہی نے گھوڑے پر بیٹھ کر ان للہ پورش ہاتھیوں پر حملے کئے اور ان کی سونڈ کاٹ ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھگوڑے ہاتھیوں نے شجاع ہی کی فوج کو کچل کے رکھ دیا۔ ایک اور موقعہ پر مسلسل

تین مردمیدان راجپوتوں کو ایک ایک وار سے ختم کیا۔ یہ تینوں راجپوت حقیقی بھائی تھے۔ قتل ہونے کے بعد ان کی ماں شیخ وجیہ الدین سے آکر ملی اور اپنا منہ بولا بیٹا بنایا۔ جسے شاہ وجیہ الدین نے بھی تسلیم کر لیا۔ شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے تھے کہ:۔

من بارہا بخانہ او رفتم او را جدہ	بارہا میں اس بڈھی کے گھر جاتا تھا
می گفتم وے در شفقت دقیقہ فرو	اور اس کو میں دادی دادی کہتا تھا
نمی گزاشت بلکہ من جدہ خود را ندیدہ	وہ بھی مہربانی اور شفقت میں کوئی
بودم و در صغر نمی دانستم کہ مرا بجز ایں	دقیقہ نہ اٹھا رکھتی تھی۔ بلکہ اپنی واقعی
عجوزہ جدہ دیگر بودہ است	دادی کو چونکہ میں نے نہیں دیکھا تھا
	اس لئے بچپن میں اس بڈھی کے

سوائیں اپنی دادی کسی اور کو نہیں جانتا تھا۔

ایک مشہور بہادر سید شہاب الدین نے آپ سے بدمعاملگی کی۔ شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ میرے سامنے والد نے اسے ایک طمانچہ رسید کیا۔ جس سے وہ بیہوش ہوکر گر گیا ——— بہرحال شیخ وجیہ الدین کا مدت العمر مشغلہ یہی فوجی خدمت تھی۔ اگرچہ آخر عمر میں نوکری چھوڑ دی تھی۔ لیکن بڑھاپے میں پھر گھوڑا خرید کر جہاد کے لئے دکن روانہ ہوئے اور راہ میں شہادت میسر آئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جسم پر بائیس گہرے زخم تھے۔ سر کٹ جانے کے بعد بھی ایک غلیل کی زد تک آپ کی بے سرلاش دشمن کا تعاقب کرتی رہی ——— تقریباً یہی حال شاہ ولی اللہ نے اپنے پردادا

معظم کا لکھا ہے۔ اور مسلسل پشتہا پشت تک ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ خاندان فوجی مہمات میں نام آور اور دیدہ ور رہا ہے۔ شاہ ولی اللہ خود اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

حضرت دیگر اخلاق سلیمہ مرضیہ از	ایشاں باخلاق سلیمہ پسندیدہ
کے ساتھ شجاعت، بہادری و غیرت	شجاعت و فراست و کفایت و غیرت
وغیرہ صفات سے بوجہ اتم موصوف تھے	بوجہ اتم متصف بودند۔

اگرچہ شاہ عبدالرحیم صاحب کو فوجی خدمت انجام دینے کا کوئی موقع اپنے اسلاف کے مطابق نہ ملا۔ لیکن اس فقرہ سے ان کی شجاعت اور بہادری کا حال بھی معلوم ہوتا ہے[1]۔ اور خود شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق تو مشہور ہی ہے کہ "ترجمہ قرآن" کی بنیاد پر دلی کے بعض پرانے خیال کے مولویوں نے جب آپ سے اختلاف کیا اور اختلاف کو اس حد تک پہنچا دیا کہ عوام میں کافی بدظنی و برہمی پیدا ہوئی۔ اسی سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ فتح پوری کی مسجد میں تقریباً سو سوا سو لچوں اور بدمعاشوں کو لے کر

[1] سیرت سید احمد شہید کے مقدمہ میں علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ نے شاہ عبدالرحیم صاحب ہی کے تذکرہ میں ارقام فرمایا ہے کہ

"شاہ عبدالرحیم کے مجاہدانہ جذبات کا پتہ ان کے خطوط سے ملتا ہے۔ ان کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامع عثمانیہ حیدرآباد کے کتب خانہ میں میری نظر سے گزرا ہے اس میں ان کا خط نظام الملک آصف جاہ اوّل کے نام ہے جس میں انہوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کی ترغیب دی ہے۔" ۱۲ منہ۔

بعض ملاؤں نے آپ کو گھیر لیا۔ شاہ صاحب کے ساتھ صرف چند رفقاؤ اور آپ کے ہاتھ میں صرف ایک پتلی لکڑی تھی۔ اسی لکڑی کو لے کر اس خونی مجمع میں جو باضابطہ تلواروں اور دوسرے ہتیاروں سے مسلح تھا۔

"غیر معمولی جوش کی حالت میں اللہ اکبر کا ایک نعرہ مارا۔ اور اس جماعت کو چیرتے پھاڑتے نکلے چلے گئے۔" (حیات طیبہ)

یوں بھی شاہ صاحب کو سیاسی مسائل اور حکومتی نظامات کے متعلق جو دلچسپی تھی۔ اس کا اندازہ ان کی مختلف کتابوں مثلاً ازالۃ الخفاء اور حجۃ اللہ وغیرہ کے سیاسی مباحث سے ہوتا ہے۔ سیاسیات میں اُن کی رائے کتنی عمیق اور دور رس ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے لئے مستقل مضمون کی ضرورت ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ شاہ صاحب کی عام متداول کتابوں میں اس کا کافی مواد موجود ہے۔ کوئی چاہے تو ان کو موجودہ اصطلاحات اور تعبیروں کے قالب میں ڈھال کر بیان کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اگر فرصت بدرست ہوئی تو شاید اس کام کو میں ہی کبھی انجام دوں۔ بالفعل صرف ان کی طرف اشارہ کر کے میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ باوجود ایسے ماحول اور اسباب کے شاہ صاحب نے سنانی۔ اور سیفی مجاہدہ کی راہ کیوں اختیار نہیں کی[1]۔ یہ تو قطعاً غلط ہے کہ وہ اس مسئلہ کے متعلق جس پر آمنی اسلامے

[1] حضرت شاہ صاحب نے تفہیمات الٰہیہ میں ایک جگہ "جہاد بالسیف" کے بارہ میں بھی اپنی قابلیت کو خود ہی بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیمات ص۲۰ ج ۱۔ اور وہیں سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ راہ کیوں اختیار نہیں کی۔ ۱۲۔

یوم القیٰمۃ (یعنی جہاد کا قانون قیامت تک کے لئے نافذ ہے) کی ہر فوت کننہ ہے۔ اس قانون کو شاہ صاحب خدانخواستہ کسی خاص زمانہ تک محدود سمجھتے تھے۔ بلکہ اپنے اجداد کے حالات کو درج فرماتے ہوئے جہاں اپنے جدِ امجد کی بہادری کے واقعات لکھنے لگے ہیں۔ تو اس سے پہلے آپ نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے :۔

کہ چندے ازیں باب دریں کتاب می نویسم کہ تنبیہے باشد اہل ایں

چند واقعات میں اسی لئے اس کتاب میں درج کرتا ہوں تاکہ اس خاندان کے لئے وہ بیداری کا پیغام اور سبب ہوں۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ دوسری ہی پشت میں حضرت شاہ صاحب کے گھرانے سے جو وہ مرد غازی مولٰنا اسمٰعیل شہید اٹھے۔ اور ایک مدت تک بجائے قلم کے تلوار کو کمر سے لگائے رہے تا ایں کہ اسی راہ میں بالآخر جانِ عزیز بھی نذر کی۔ یہ شاہ صاحب کی کسی اندرونی تربیت کا نتیجہ نہ تھا۔ جس کا رواج اُن کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔

باوجود ان تمام باتوں کے پھر میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ شاہ صاحب نے آخر یہ راہ خود کیوں اختیار نہیں فرمائی۔ مجھے اب تک ان کے کلام میں کوئی چیز صراحتہً نہیں ملی ہے۔ آئندہ اگر کوئی چیز ہاتھ آئی تو انشاء اللہ پیش کی جائے گی۔ بالفعل ان کے مسلک کے متعلق اس باب میں جن وجوہ تک پہنچ سکا ہوں انہیں درج کرتا ہوں۔ فیوض الحرمین میں شاہ صاحب نے

"تحقیق شریف" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ اگرچہ کچھ طویل ہے لیکن جب تک پورا مضمون نقل نہ کیا جائے مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ میرے نزدیک شاہ صاحب نے اس مضمون میں خدمت دین کا جذبہ رکھنے والوں کے لئے خاص ایسے وقت کے واسطے جبکہ کسی وجہ سے اعلاء کلمۃ الحق کے لئے "جہاد بالسیف" کا امکان نہ ہو کام کا پورا پروگرام پیش کر دیا ہے ——— ارقام فرماتے ہیں :-

خلافت ظاہرہ للأمة	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
خلافت باطنہ المرحومة	زندگی میں امت مرحومہ کے لئے
اسوة حسنة برسوله	اسوہ اور نمونہ ہے (پھر اس نمونہ
صلى الله عليه وسلم	کی تقسیم یوں کرتے ہیں) ظاہری
لاصحاب الخلافة الظاهرة	خلافت والے یعنی جو شرعی حدود
اعنى المعتنين باقامة	اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری
الحدود واعداد ادوات الجهاد	اور سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی
وسد الثغور واجازة الوفود	وحفاظت اور وفود کو اکرام و انعام
وجباية الصدقات والخراج	دینے کی خدمت اور صدقات محصول
وتفريقها على مستحقها	مالگذاری وغیرہ کی وصولی پھر ا
وفصل الاقضية والنظر	ستحقاق بیان کے تقسیم
في اليتامى واوقاف المسلمين	مقدمات کے فیصلے، یتیموں کی
وطرقهم ومساجدهم	نگرانی، مسلمانوں کے اوقاف کے

واشياء هذه الامور
فمن كان مشتغلا
بهذه الامور فسمية
بالخليفة الظاهرة
لهم اسوة حسنة
برسول الله صلى الله
عليه وسلم فيما سنّ
فى هذا الباب بالتفصيل
المذكور فى كتب
الحديث ــــــ
ولاصحاب الخلافة
الباطنية اعنى المعتنين
بتعليم الشرائع والقرآن
والسنن والآمرين
بالمعروف والناهين
عن المنكر والذين
يحصل بكلامهم
نصرة الدين اما بالمجادلة
كالمتكلمين او بالموعظة

انتظام، نیز راستوں، سڑکوں
اور مساجد وغیرہ کی تعمیر
اور کسی قسم کے اور کاموں کے
لئے مقرر ہیں۔ بغرض مسلمانوں میں
جو ان خدمات اور مشاغل میں مصروف
ہیں انہیں کو میں خلافت ظاہری والوں
کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔ ان
لوگوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی سیرت میں بہتر نمونے
ہیں جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان امور کے متعلق جاری فرمایا۔
اور حدیث کی کتابوں میں جن کی
تفصیل مذکور ہے۔ اور جو لوگ باطنی
خلافت والے ہیں یعنی جو اس کام پر
مقرر ہیں کہ شرائع اور قوانین اسلامی
قرآن اور سنن و آثار کی تعلیم دیں
اور معروف یعنی اچھی باتوں کا
لوگوں کو حکم دیں بری اور منکر
باتوں سے روکیں۔ اسی طرح وہ

لخطباء الاسلام	لوگ جن کے کلام سے دین کی تائید
اوبصحبتهم کمشائخ الصوفیة	ہوتی ہے۔ خواہ مناظرہ اور مباحثہ
والذین یقیمون الصلوة	کی راہ سے جیسا کہ متکلمین اسلام
والحج والذین یدلون	کا حال یا وعظ و پند کے طریقے سے
علی طریق اکتساب الاحسان	جیسا کہ اسلام کے مقررین اور
والمرغبون فی النسك	خطباء جس خدمت کو انجام دیتے
والزهد والقائمون	ہیں یا وہ لوگ جو اپنی صحبت اور
بهذا الامر هم الذین نسمیهم	توجہ و ہمت سے اسلام اور مسلمانوں
بالخلفاء الباطنین لهم	کی خدمت کرتے ہیں۔ جیسا کہ مشائخ
اسوة حسنة برسول الله	صوفیہ کا حال ہے۔ اسی طرح جو
صلے الله علیه وسلم	نمازیں قائم کراتے، حج کراتے ہیں
فیما سنّ من هذا الباب	اور جو احسان (دوام حضور) کے
بالتفصیل المذکور فی	حصول کی راہ لوگوں کو بتلاتے ہیں
کتب الحدیث۔	اور زہد و تقویٰ کی طرف لوگوں کو

راغب کرتے ہیں بہرحال جو لوگ ان دینی خدمات کو انجام دیتے ہیں۔ ان ہی لوگوں کو ہم خلفاء باطنی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان لوگوں کے لئے بھی بہترین نمونے ہیں یعنی اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ عمل اختیار فرمایا اور حدیث کی کتابوں میں جس کی پوری تفصیل موجود ہے۔"

اس کے بعد شاہ صاحب نے خلافت کی دونوں صورتوں اور ان کے لوازم و آثار سے بحث کی ہے۔ جس کے درج کرنے کی سردست ضرورت نہیں ہے۔

شاہ صاحب کی مذکورہ بالا عبارت ہی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت و نمائندگی اور "خلافت" کا انحصار محض سیاسی اقتدار کے مظاہر کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جو نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کو بھی "خلافت" کا ایک حصہ ملا ہے۔ جیسے سیاسی اقتدار رکھنے والوں اور حکومتی خدمات انجام دینے والوں کو بھی اس کا ایک ہی شعبہ ملتا ہے ——

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک قدرت نے جس کسی کو جس قسم کی خلافت اور نیابت نبوت کے مظہر بننے کا موقعہ عطا فرمایا ہے وہ وہ اسی اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھ کر اپنے کاروبار کی تنظیم کرے اور اسی شعبہ کے اسوۂ نبوی کو شمع راہ بنا کر اپنے فرائض خلافت کو انجام دے ——— گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ اسلام نے مثلاً امراء کو بھی مخاطب کیا ہے اور غرباء کو بھی — تندرستوں کو بھی اور بیماروں کو بھی، احرار کو بھی اور عباد و اماء کو بھی، ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان سب کے فرائض بالکل یکساں ہیں بلکہ امراء جنہیں قدرت نے مال و دولت عطا کی ہے اُن ہی کے ساتھ ان احکام کا تعلق ہے جو مالیات سے متعلق ہیں اور جو صحت کی دولت

سے سرفراز ہیں۔ ان ہی تک وہ احکام محدود رہیں گے۔ جن کی ادائیگی صحت کے ساتھ مشروط ہے پس اسی طرح گو قرآن نے ہر قسم کے احکام کی تبلیغ کی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جامع زندگی سے تقریباً ہر حکم کے متعلق تشریح کے نمونے پیش فرمائے ہیں لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کے ہر حکم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر نمونہ کی اتباع پر ہر مسلمان مساوی طور پر مجبور کیا گیا ہے بلکہ جو خوش بخت خلافت ظاہرہ کے اسباب وادوات سے سرفراز ہیں وہ اس بات میں مکلف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز حکومت اور طریقہ سیاست کو اختیار کریں اور اس کو دنیا میں سربلند کرنے کے لئے تدابیر عمل میں لائیں ـــــــ علیٰ ہذا جس کسی کو خلافت باطنہ کا جو حصہ عطا ہوا ہے وہ اسی پہلو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ "تفہیمات الٰہیہ" میں شاہ صاحب نے اپنے جس طویل خطاب سے مسلمانوں کو خطاب فرمایا ہے۔ جس کا ترجمہ پہلے درج کر چکا ہوں اس میں آپ نے مسلمانوں کے مختلف طبقات کو الگ الگ کرکے پکارا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ ہر مسلمان پر اس عام دعوت کو پیش فرماتے خصوصیت کے ساتھ "ملوک اسلام کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں :-

ایہا الملوک المرضی	بادشاہو! ملاء اعلیٰ کی مرضی اس
عند الملاء الاعلیٰ	زمانہ میں تمہارے متعلق یہ ہے۔
فی ھذا الزمان ان تسلّو	کہ تلواریں سونت لو پھر انہیں

السیوف ثم لا تغمدوھا	نیام میں نہ کرو۔ جب تک اللہ تعالیٰ
حتی یجعل اللہ فرقاناً	مسلمانوں کو مشرکوں سے بالکل جدا
بین المسلمین والمشرکین	نہ فرمادے اور کفار کے سرکش افراد
وحتی یلحق مردۃ الکفار و	نیز فساق کمزوروں میں جاکر شریک نہ
الفساق بضعفائھم لا یستطیعون	ہو جائیں اور خود اپنے لئے ان میں
لانفسھم شیئاً وھو قولہ تعالیٰ	کچھ کرنے کی سکت باقی نہ رہے۔ یہی
وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و	مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس
یکون الدین کلہٗ للہ۔	قول کا کہ جنگ کرو کافروں سے اس

حد تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور "دین" "قانون" صرف اللہ کے لئے مختص ہو کر رہ جائے۔

الغرض خصوصیت کے ساتھ بجائے عام مسلمانوں کے اس خطاب میں شاہ صاحب نے ملوک یعنی ان ہی لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے سیاسی اقتدار اور عسکری قوت کے مالک ہیں پھر آپ نے ان کو صرف اس "سلبی کام" ہی کا مخاطب نہیں بنایا ہے۔ بلکہ اس کے بعد حکومت کے ایجابی احکام کا مکلف بھی ان ہی کو قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

فاذا ظھر الفرقان فرضاء	جب مسلم و کافر میں اس طرح جدائی
الملاء الاعلیٰ ان تنصبوا	پیدا ہو لے تو اس کے بعد ملاء اعلیٰ
فی کل ناحیۃ وفی کل	کی رضا یہ ہے کہ تم اسے بادشاہو!

مسيرة ثلاثة ايام واربعة
ايام اميراً عادلاً يأخذ
للمظلوم حقه من الظالم
ويقيم الحدود ويجتهد
ان لا يحصل فيهم بغي ولا
قتال ولا ارتداد ولا كبيرة
ويفشو الاسلام وتظهر
شعائره ويأخذ بنزا نفسة كل
كل احد ويكون لامير كل بلد
شوكة يقدر بها على اصلاح
بلده ولا يكون له شوكة
يتمتع بسببها ويعصى على السلطان
وينصب في كل اقليم كبير امير
يقلده القتال فقط ويكون
معه اثنا عشر الفا من المجاهدين
لا يخافون في الله لومة
لائم ويقاتلون كل باغ
وعاد فاذا كان ذالك فرماء
الملاء الاعلى ان

ہر علاقہ اور تین دن یا چار دن کی
مسافت پر ایک صاحب عدل
امیر کو مقرر کرو۔ جو ظالم سے مظلوم
کا حق لے سکتا ہو۔ اور شرعی حدود
قائم کر سکتا ہو۔ اور اس کی کوشش
کرے کہ ان کی طرف سے پھر سرکشی
اور فساد پیدا نہ ہو اور ارتداد اور
کبیرہ کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ اسلام
بالکل فاش اور علانیہ ہو جائے اس
کے شعائر کھلم کھلا ظاہر ہوں اور
اپنے منصبی فرائض کو ہر شخص اختیار
کرلے۔ چاہئے کہ ہر شہر کے امیر
کے پاس اتنی قوت و شوکت ہو۔
جس کے ذریعہ سے اپنے شہر کی
اصلاح پر وہ قابو پا سکے۔ مگر اتنی
شوکت و قوت اس کے پاس نہ ہو
کہ اُن سے خود نفع اٹھانے لگے۔ اور
بادشاہ وقت سے سرکشی کرنے لگے
چاہئے کہ ہر اقلیم (صوبہ) میں ایک بڑا

یفتش حینئذ من الانتظامات المنزلیہ والعقود ونحوہ حتی لا یکون شیئٌ لا موافق الشرع حتی یامن الناس من کل وجہ (تفہیمات الٰہیہ ج ۲ صـ ۲۱۶)

امیر بھی مقرر ہو جس کے ذمہ حفظ جنگ کی ذمہ داری عائد کی جائے چاہئے کہ اس کی فوجی جمعیت ایسے بارہ ہزار مجاہدوں کی ہو جو اللہ کی راہ میں کسی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوں اور ہر سرکش باغی سے جنگ کر سکتے ہو جب یہ ہو چکے تب چاہئے کہ منزلی انتظامات (اور معاشری قوانین) اور عقود و معاملات کی جانچ پڑتال کی جائے اور اسی قسم کی دوسری باتوں کی (پھر ایسی صورت اختیار کی جائے) کہ کوئی بات ایسی باقی نہ رہ سکے جو شریعت کے مطابق نہ ہو۔ تاکہ لوگ ہر لحاظ سے امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے لگیں۔"

اس قسم کے خاص خاص خطابات اور مخصوص دعوات کا ذکر شاہ صاحب کے کلام میں دوسرے مقامات پر بھی ملتا ہے لیکن میں سردست اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ شاہ صاحب کا اس کے بعد جو مسلک منتج ہوتا ہے میں اب اس کی اس سے زیادہ تصریح نہیں کرنا چاہتا اور نہ اب مزید کی ضرورت ہے۔

سیاست اور اسلام کا واقعی تعلق شاہ صاحب کی نظر میں | آج جب

دنیا کا ہر طبقہ ایک قسم کے سیاسی بحران میں مبتلا ہے اور انسانیت کے اول و آخر، ظاہر و باطن میں اب بجز "سیاست" کے اور کچھ نہیں رہ گیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو اسلام کو صرف "سیاست" اور "سیاست" کو صرف "اسلام" قرار دینے پر مُصر ہے گویا ان کے غلاۃ کے نزدیک ہر شخص کے اسلام و ایمان، دینی خدمات کی بھلائی و برائی کا سارا دار و مدار اسی پر رہ گیا ہے۔ اُن کے خیال میں اب "خیر" بلکہ ایمان بھی صرف اس میں ہے جو موجودہ سیاسی قصّوں میں اپنا کچھ نہ کچھ پارٹ ادا کرتا ہو۔ اور جو بیچارے کسی وجہ سے (اگرچہ آج کل کی سیاست کی گندگی ہی کی وجہ سے) ان "سیاسی مشاغل" سے محروم ہیں خواہ دوسرے نقطۂ نظر سے یعنی شاہ ولی اللہ کی اصطلاح میں "خلافت باطنیہ" کی راہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے بہترین نمونے کیوں نہ پیش کرتے ہوں وہ بزدل، ناکارہ اور بعضوں کے نزدیک تو مخذول و مردود ہیں۔ بلکہ ان کی موت بھی ان کے خیال میں جاہلیت کی موت ہے اور ان کی زندگی بھی جاہلیت کی زندگی ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں۔ کہ ارباب سیاست کا یہ اجتہاد واقعی اسلامی نصوص و نبوی آثار و سنن اور فقہاء اسلام کے مجتہدات پر کس حد تک منطبق ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کا نقطۂ نظر جیسا کہ اُن کی مذکورۂ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔ اس باب میں جو ہے اُس کو دیکھ کر کیا یہ حضرات اپنے اس طرزِ عمل میں کچھ تغیر فرما سکتے ہیں؟

اسی طرح جو لوگ ہندوستان یا بیرون ہند کی بعض بچی کھچی ملوکی اور سیاسی قوتوں کے بالکل استیصال یا "فک کل نظام" کا مشورہ محض اسلئے دے رہے ہیں کہ ان کے یہاں مغربی نظامات اور عقود و معاملات یا دوسر لفظوں میں بعض معاشرتی اور معاشی قوانین ایسے مروج ہیں جو شریعت اسلامیہ کے دفعات پر منطبق نہیں ہیں۔ اگرچہ زیادہ تر ان مشوروں کا محرک اس زمانہ میں شریعت کا درد نہیں بلکہ مغربی مکاتب خیال میں سے کسی مکتب خیال کے تاثر و انفعال کا یہ نتیجہ ہے خواہ اس تاثر کا دماغوں کو شعور ہو یا نہ ہو تاہم یہ مان بھی لیا جائے کہ "انقلاب" "بالکل انقلاب" کے ان نقیبوں کی چیخ و پکار کے پیچھے شریعت محمدیہ ہی کا درد اور اسی کے اعلاً کا صادق جذبہ کار فرما ہے لیکن سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب نے دعوت کی جو ترتیب پیش کی ہے اور یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے عیسائی بادشاہوں اور مجوسی ملوک و عظماء کو شروع ہی میں شریعت کے منزلی نظامات اور عقود و معاملات کی پابندی کی دعوت نہیں دی۔ اور نہ ان کے جمہوری یا شخصی نظامات حکومت کی تبدیلی کا ابتداً مطالبہ کیا۔ بلکہ آپ کی اول دعوتِ توحید اور اسلام تھی۔ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی نقطۂ نظر تھا کہ اگر وہ اسلام کو قبول کریں گے۔ تو ان کی زمین جائداد، اموال وخراج سے فوری طور پر کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ البتہ بتدریج اُن کے معاشرتی اور معاشی مفاسد کی اصلاح کی جائے گی۔ آخر نجاشی ابی سینیا کا عیسائی بادشاہ

جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ مسلمان ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ جو طرز عمل اختیار فرمایا تھا۔ کیا اس میں ہمارے لئے کوئی اسوۂ حسنہ نہیں ہے؟ کیسی عجیب بات ہے کہ آج جن علاقوں میں مسلمانوں کی تھوڑی بہت سیاسی قوت خواہ وہ کسی حال میں ہو باقی ہے مسلمانوں کو ان کے متعلق مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان حکومتوں کے بعض معاشرتی اور معاشی قوانین چونکہ شرعی قوانین سے مختلف ہیں۔ اس لئے چاہئے کہ ان کا تختہ الٹ دیا جائے اور کوئی مسلمان ان کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی نہ رکھے۔ اُن کا وجود و عدم برابر ہے۔ اور پھر اسلام کے اُن احکام واوامر جن کی تعمیل کے لئے خلافت ظاہرہ یا سیاسی قوت کی ضرورت ہے عمل پیرا ہونے کا مطالبہ ان غریب مسلمانوں سے کیا جائے جو بیچارے قدرتاً ان کی سرانجامی سے مجبور ہیں گویا اس کے معنے یہ ہوئے۔ کہ امراء چونکہ اپنے اموال شرعی طریقوں پر خرچ نہیں کرتے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ ان کو شرعی طریقوں کی پابندی کی دعوت دی جائے۔ یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان کو بھی غریب بنا دیا جائے اور پھر مفلسوں پر زکوٰۃ اور عشر و صدقات کے ٹیکس عائد کئے جائیں۔

اس باب کی ایک اور غلطی پر انتباہ،

ایسے ہی میرے خیال میں جو لوگ آج کل یہ تعبیر پھیلا رہے ہیں کہ اسلام صرف حاکموں کا مذہب ہے محکوم ہو کر زندہ رہنے کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے۔ اور دلیل میں اسلام کے

ان قوانین واوامر کو پیش کرتے ہیں۔ جو بغیر حکومت کی قوت کے سرانجام نہیں پا سکتے ان کی مثال ایسی ہے کہ زکوٰۃ وعشر کے احکام دکھا کر اعلان کر دیا جائے کہ غریب ہو کر جینے کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں یا روزہ حج وغیرہ کے فرائض کو دیکھ کر دعویٰ کر دیا جائے کہ بیماروں اپاہجوں کے وجود کا اسلام روادار نہیں کیونکہ غریب اسلام کے اہم احکام مثلاً "آتوالزکوٰۃ" کی بیمار "فلیصمہ" یا "لِلّٰہ علی الناس حج البیت" کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ میرا ہرگز اس سے یہ منشاء نہیں ہے کہ اسلام کو محکومی مطلوب ہے یا حکومت واقتدار کا اسلامی نظام میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ نیز یہ بھی میرا مطلب نہیں ہے کہ جو مسلمان "امرار" اسلامی ودلی نظام اور اسلامی احکام کے پابند نہیں ہیں ان کے اس حال کی اصلاح کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ دوسرے معاملات کی طرح ان چیزوں میں بھی غلو نہ کیا جائے اور مغربی احوال وتحریکات سے متاثر ہونے اور ان کے طریق کا اتباع کرنے کے بجائے "اسوۂ حسنہ نبوی" ہی کو ان کاموں میں بھی شمع راہ بنایا جائے۔ میں یہاں ان معاملات میں اپنی کوئی خاص رائے پیش نہیں کر رہا ہوں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ان امور میں کسی رائے کے قائم کرنے کا مجھے مقام بھی حاصل نہیں۔ بلکہ میں تو حضرت شاہ صاحبؒ کے کلام سے جو بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ صرف بطور تشریح اُس کا اظہار کر رہا ہوں۔ اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ اب تک اس کے خلاف مجھے

اُن کی کتابوں میں کوئی دوسری چیز نہیں ملی ہے۔ اور خود آپ کی زندگی میں بھی اس کے سوا کسی دوسرے پہلو کی شہادت نہیں ملتی۔ ممکن ہے کہ یہ میرے محدود معلومات اور قلت فکر و نظر کا نتیجہ ہو۔ لیکن میں اب تک یہی سمجھے ہوئے ہوں کہ "اسوۂ حسنہ نبوّت کبریٰ" کی پیروی کو شاہ صاحب صرف "خلافت ظاہرہ" کے اور اس کے مظاہر و آثار کے ساتھ وابستہ نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اُسی کے ساتھ اُن کے نزدیک اسوۂ حسنہ کی پیروی کی ایک دوسری راہ خلافت باطنہ کے ذریعے سے بھی تھی۔ اور انہوں نے اپنے گردو پیش کے واقعات، اپنے ماحول، خود اپنی اندرونی اور بیرونی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر کے بجائے "خلافت ظاہرہ" کے میدان میں اترنے کے "خلافت باطنہ ہی کی راہ سے اسوۂ حسنہ کی پیروی کے امکانات اپنے لئے پیدا کئے اور ان ہی طریقوں سے اپنی وسعت و طاقت کی حد تک وہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے آستین چڑھا کر حق تعالےٰ کی غیبی نصرتوں کے بھروسہ پر تیار ہو گئے۔ پھر اس سلسلہ میں اُن کے متوازن دماغ اور معتدل مزاج نے اس کی اجازت نہیں دی کہ خلافت باطنہ کے جتنے شعبے ابتدائے تاریخ اسلام سے ان کے زمانہ تک کھلے ہوئے تھے اور جن میں سے ہر ایک کا اسوہ "حقیقت جامعہ محمدیہ" (علی صاحبہا الف سلام و تحیہ) میں پایا جاتا تھا۔ ان میں سے کسی شعبے کی واقعی قدر و قیمت کا انہوں نے انکار کیا ہو۔ اور جیسا کہ عموماً ہر طبقہ کے غلاۃ اور تشدد پسندوں کا عام شیوہ ہے کہ اپنے وہی کے سوا ہر ایک کے دماغ کی ترشی کا

ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ متکلم صوفی کو خشک دماغ بتلا کے مالیخولیا قرار دیتا ہے۔ صوفی، متکلم کو حقائق و اسرار کی دنیا سے اندھا و محروم ٹھیرا تا ہے۔ فقیہ، محدث پر تیوریاں چڑھاتا ہے۔ ایسے ہی محدث، فقیہ پر تنگ نظری اور تقلید جامد کا الزام لگاتا ہے۔ مگر حضرت شاہ صاحب سب کی تصحیح فرماتے ہیں۔ ہر ایک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باطنی خلافت کا حصہ دار سمجھتے ہیں۔

شاہ صاحب کی جامعیّت

اور یہ شاہ صاحب کی اسی جامعیت اور ہمہ گیر فطرت کا ثمرہ ہے جو خدائے بخشندہ نے ان کو بخشی تھی جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ یعنی

وھہات ھذہ المناقضات	آہ! کہ میری فطرت میں یہ متضاد و
منی لولاان شدۃ الجامعیۃ	متناقض امور پائے جاتے ہیں۔
اوقعتنی فی ذالک	لیکن کیا کروں میری ہمہ گیر جامعیت
(فیوض الحرمین)	نے مجھے اس حال میں مبتلا کیا ہے۔

غالباً یہ ہر جہتی مناسبت شاہ صاحب کو اپنے والد سے ترکہ میں ملی تھی۔ "انفاس العارفین" میں ایک موقعہ پر حضرت شاہ عبدالرحیم کے متعلق ارقام فرماتے ہیں:-

شاہ عبدالرحیم کی جامعیّت

از ہر علم بہرہ معتد بہ داشتند و بہ ترک مناسبت لطیفے از فنون طبع ایشاں رہنمائی داد۔ (صفحہ ۱۴۴)

ہر علم سے کافی مقدار کے حصہ دار تھے اور فنون میں سے کسی فن کے متعلق مناسبت ترک کرنے پر آپ کی طبیعت راضی نہ تھی۔

شاہ عبدالعزیز کی جامعیت

سنا جاتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تک جامعیت کا یہ ذوق اس خاندان میں باقی رہا۔ ملفوظات عزیزیہ کے جامع نے تو براہ راست شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ ایک کتاب کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس وقت حضرت نے ارشاد فرمایا۔

علمے کہ دیدہ ام و یاد ہم بقدر خود دارم یک صد و پنجاہ علم است

جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور اپنی وسعت بھر مجھے یاد بھی ہیں اُن کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔

پھر اس میں دینی علوم کی خصوصیت نہ تھی۔ خود شاہ صاحب کی زبانی اس کی تشریح منقول ہے کہ:۔

نصف آں مردماں سابق و نصف دریں امت تصنیف شدہ۔

ان علوم میں سے آدھے تو ایسے علوم ہیں جو گذشتہ امتوں اور قوموں میں پیدا ہوئے۔ اور نصف وہ ہیں۔ جو اسلامی امت کی تصنیف ہیں۔

طلب کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو جامع ملفوظات نے نقل کیا ہے۔ یعنی حسب دستور شاہ صاحب پیادہ پا ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ کسی مکان سے گانے کی آواز آرہی تھی فرمایا "دھناسری ہے (یہ ہندی راگ کی کوئی قسم ہے) آگے ایمن ملتانی وغیرہ

راگوں اور گتوں کا ذکر فرماتے جاتے تھے اور آخر میں ارشاد ہُوا کہ :-

سابق مرا دریں فن حظے بسیار بود چنانچہ ناموراں ایں فن برائے تحقیق می آمدند حالا موقوف کردم۔ لیکن مے آئند حالا مرا ضرر می کند یعنی قلب جوش می کند و بعد اناں مرض ہم حائل گردد۔

پچھلے دنوں میں اس فن (موسیقی) میں مجھے بڑا دخل تھا چنانچہ اس فن کے نامور لوگ اس فن کے مسائل کی تحقیق کے لئے میرے پاس آتے تھے لیکن اب مَیں نے اس سلسلہ کو موقوف کر دیا ہے۔ مگر پھر بھی لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ مگر اب مجھے اس کا اشتغال ضرر پہنچاتا ہے یعنی دل میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد بیماری بھی حائل ہو جاتی ہے [1]

[1] غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ شاہ صاحب اپنی زندگی کے کسی دور میں بالعیاذ باللہ ان مکروہات شرعیہ میں مبتلا تھے ملفوظات میں ہے کہ کسی نے دریافت کیا "میل حرام گناہ ہے فرمودہ اند" جواب میں ارشاد فرمایا گیا "اے دو بار آنچہ بود کہ در جوانی شنیدم کہ قصہ خوانی خوش گو آمدہ است بہ ترغیب احباب قصد کردم ناگاہ آواز مزامیر و رقص در گوش رسید خواستم کہ زید بید از شستہ شنیدہ راہی مقصد شوم مجرد نشستن خواب غلبہ کرد چون چشم باز کردم صبح بود باز دیگر ہیں ماجرا پیش آمد"۔ صد ۹۹
اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ رقص و سرود کی مجلس میں نہیں بلکہ سرود ہمسایہ کے طور پر بھی آپ اس میں شریک نہ ہوئے اسی ملفوظ سے پہلے شاہ صاحب کا ایک فتویٰ یہ بھی ہے "از وقت شباب از رقص وغیرہ ممنوعات نفرت طبعی داشتم صد ۹۹۔ لہذا مطلب یہ ہے کہ فن موسیقی کو شاہ صاحب صرف علمی طور پر جانتے ہیں۔ ۱۲ -

غرض "این خانہ تمام آفتاب است" کا مصداق فضل وعلم کا یگھرانا بنا رہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس کی نظیر ہند کیا بیرون ہند کی اسلامی دنیا میں بھی مشکل سے میسّر آسکتی ہے۔ طوالت جواب حد سے زیادہ متجاوز ہو رہی ہے۔ اس کا خوف نہ ہوتا تو کچھ دوسروں کا بھی اس سلسلہ میں ذکر کرتا۔

بہر حال میں گفتگو، شاہ صاحب کے توازن صادق اور اعتدال صحیح کے متعلق کر رہا تھا کہ اسی کی بدولت اسلام کے علمی و دینی خادموں کے ہر طبقہ کی صحیح قیمت وہ پہچان سکے۔ دوسروں کی طرح انہوں نے اپنے طبقہ کے سوا اوروں کو ناکارہ نہیں ٹھیرایا۔ ان کے نزدیک فقیہ و صوفی اور محدّث و متکلّم سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باطنی خلفاً ہیں۔ البتہ اسی کے ساتھ "طول آمد" کی وجہ سے قدرۃً دلوں میں جو ایک قسم کی بے حِسّی یا قساوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے اسلامی خطّوں میں بھی ہر شعبہ کو "اسوہ حسنہ" کے حدود سے بہت آگے نکال دیا تھا۔ اور اس کی شکایت شاہ صاحب کو ہر طبقہ سے ہے۔ جس کی کچھ مثالیں میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔

علماء دین میں شاہ ولی اللہ کی امتیازی شان اور آپ کے خاص کارنامے

اب تک میں جو کچھ لکھ چکا ہوں گو ان ہی متفرق و منتشر اسعد نے میرے دل میں اس خیال کو پیدا کیا ہے۔ کہ عام اہل علم یا ارباب درس و تدریس و تالیف و تصنیف کے مساعی کی جو نوعیت ہوتی ہے۔ حضرت

شاہ ولی اللہ کے علمی خدمات کی نوعیت ان سے مختلف ہے۔ میں نے تمہید ہی میں عرض کر دیا تھا کہ شاہ صاحب کی علمی سرگرمیوں خصوصاً ان کے تصنیفی کاروبار کے پیچھے بعض اہم مقاصد اور اغراض کم از کم مجھے چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ مقاصد اور منصوبے ان کے دل میں جن اسباب و علل سے پیدا ہو سکتے تھے۔ دراصل اس وقت تک اجمالاً ان ہی کا ذکر کیا گیا اب میں شاہ صاحب کے "ہر منصوبے" اور اس منصوبہ یا نصب العین کے لحاظ سے جو کام کر کے وہ چلے گئے ہیں میں ترتیب کے ساتھ ان سب سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بحث کوئی واقعی تفصیلی بحث نہ ہوگی کہ اس کا یہاں نہ موقع ہے اور نہ گنجائش۔ محض ان کی ایک اجمالی فہرست پیش کر رہا ہوں۔

(۱)

فقہی اختلافات میں نقطۂ عدل

آپ کی کتابوں میں ایک بڑا ذخیرہ تالیفات کا تودہ ہے۔ جن سے اس گروہ خانہ جنگی کو ختم کرانا مقصود ہے۔ جو پچھلے چند دنوں سے ہر مذہب کے متصلب و متقشف فقہاء کی بدولت ملک میں شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اگرچہ یہ توضیح نہیں ہے جیسا کہ اس زمانہ میں مشہور کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالیوں کی زیادہ تر ذمہ داری اُن ہی فروعی اختلافات کی طرف عائد ہوتی ہے۔ سمجھا یا جا رہا ہے۔ کہ حنفیت

افعیت، مالکیت و حنبلیت کے اختلافات کی نوعیت اسی قسم کی ہے۔
لیسے یورپ میں صدیوں کلیسا اور عوام کے باہمی مذہبی اختلافات کی بھی
انکہ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" کہاں یورپ کی وہ مذہبی خانہ جنگیاں
ن میں کہا جاتا ہے کہ تقریباً دس لاکھ آدمی مختلف ظالمانہ طریقوں سے موت
ے گھاٹ اتارے گئے۔ ہزاروں کو پھانسیاں دی گئیں، لاکھوں زندہ
ائے گئے۔ فرانس کے بار تھلمی ہنگامہ میں رومن کیتھولک والوں نے
اٹسٹوں پر جو مظالم توڑے ہیں۔ ان کی داستان سن کر اس وقت تک
سانیت کا کلیجہ پھٹتا ہے۔ مسیح علیہ السلام کی ان مسکین بھیڑوں نے
ندہ بچوں کو ماؤں کے پیٹ سے چاک کر کر کے نکالا اور اپنے کتوں کو
ملایا۔ نو دن تک پیرس کی گلیوں میں صرف خون بہتا رہا۔ دریائے
ین کا پانی ان ہی کے لہو سے سرخ ہو گیا تھا۔ (القصہ بطولہا) یورپ
ہ اپنے مذہب کے ان ہی نمونوں سے ڈر کر سرے سے مذہب ہی
ے نام سے پناہ مانگنے لگا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ شاید یہ کچھ بے جا بھی نہیں
ے۔ اور موجودہ مغربی الحاد و زندقہ کی پیدائش میں مسکین سائنس اور
نام کیمیا سے زیادہ دخل سچ پوچھئے تو مذہبی نمائندوں کے ان ہی
۔ نچکاں کارناموں کو ہے۔ اگرچہ مسلم عوام کو دھوکا دیا جا رہا ہے کہ سائنس
نے یورپ میں مذہب کی چولیں ڈھیلیں کر دیں۔ حالانکہ اس دھوکے
ہی شکار ہوتے ہیں اور ہو رہے جو نہ سائنس سے واقف ہیں اور
مذہب سے۔ ورنہ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یورپ کی موجودہ مبطلانیوں

یا ہٹ دھرمیوں کے پیچھے ان کے مذہب اور مذہبی پیشواؤں کی وُہ چیرہ دستیاں چھپی ہوئی ہیں۔ جن کے نیچے صدیوں یورپ کے عوام سسکتے رہیں ہیں کتنے افسوس کی بات ہے کہ یورپ کی ان ہی مذہبی خانہ جنگیوں کو بلا وجہ اسلام کے ان فروعی اختلافات پر منطبق کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اسلام زمین کے کرہ پہ آج چودہ صدیاں گذار چکا ہے کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ محض حنفی اور شافعی ہونے کے اختلافات نے ہر جگہ نہیں تو اسلامی ممالک کے کسی خاص خطّہ میں بھی کبھی اس قسم کی خوفناک شکل اختیار کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر اس اختلاف نے کبھی حد سے تجاوز کیا ہے۔ تو قلمی لڑائیوں یا زیادہ سے زیادہ شخصی حملوں سے کبھی نہیں بڑھا ہے۔ شیعیت اور سنیت کے جھگڑوں سے اس وقت بحث نہیں کہ اس کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ میری گفتگو کا تعلق صرف ان فروعی اختلافات تک محدود ہے۔ جن کی حنفیت اور شافعیت وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اسلامی تاریخ کے اس طویل زمانہ میں کوئی ایسا اہم واقعہ ان اختلافات کی بنیاد پر پیش نہیں آیا ہے جسے یورپ کی ان خونی داستانوں کے مقابلہ میں سامنے لایا جا سکتا ہو۔

مگر جو کچھ بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدیوں میں بعض خاص حالات خصوصاً اسلام کے اصلی سرچشموں یعنی قرآن و حدیث کی تعلیم سے اسلامی مدارس جس حد تک بیگانے ہوتے چلے گئے۔ بتدریج یہ اختلاف

بہت غلط صورت اختیار کرتا چلا جاتا تھا۔ خصوصاً ما وراء النہر ترکستان و خراسان کے حنفی فقہاء کا غلو اس باب میں آہستہ آہستہ بہت آگے بڑھ گیا تھا اور ہندوستان میں وطن بنانے کے لئے اسلام جس راستہ سے آیا۔ چونکہ وہ ان ہی ممالک کا راستہ تھا۔ اس لئے قدرتاً ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت ان ہی ممالک کے علماء کی ذہنیت سے متاثر تھی۔

پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ نادری اور ابدالی حملوں نے جب اس ملک میں روہیلوں کے جدید عنصر کا اضافہ کر دیا تو تشدد و تصلب کی یہ شرارت دو آتشہ ہو چکی تھی۔

شاہ صاحب نے بڑی دانشمندی اور گہرے مطالعہ کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی بنیادوں سے پردہ ہٹایا۔ ائمہ مجتہدین اور ان کے اجتہادات کا جو صحیح مقام تھا۔ اسے واضح فرمایا۔ بعضوں کو تو شاہ صاحب سے شکایت ہے کہ ہندوستان میں غیر مقلدیت کی ابتداء آپ ہی سے ہوئی۔ اور خود غیر مقلدوں کا طبقہ اس باب میں گو نہ آپ کو اپنا پیشوا مانتا ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ اگر امت یا کم از کم ہندی مسلمانوں کے ہاتھ میں اس وقت وہ معلومات نہ ہوتے جنہیں شاہ ولی اللہ کی عرق ریزیوں نے وقف عام کیا ہے تو سرزمین نجد اور نجد سے آگے بڑھ کر حجاز میں جو تحریک "وہابیت" کے نام سے چل پڑی تھی۔ اور یورپ والوں نے اپنے خاص اغراض کے تحت اس تحریک اور

اس تحریک کے چلانے والوں کو مختلف طریقوں سے اچھالنا شروع کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ غلامی کے ان دنوں میں جن میں ایسے کم ہیں جو اپنی زبان سے اپنی بات ادا کرتے ہوں اور اپنے دماغ سے اپنے خیالات سوچتے ہوں مشکل ہی سے غلام ہندوستان میں اس وقت کوئی حنفی نظر آتا۔ اس میں شک نہیں کہ اندرونی طور پر مغربی دجل وکید نے جو دام بچھایا تھا اور ذم کی صورتوں میں اس تحریک کی مدح کا جو گیت مختلف لہجوں میں گایا جاتا تھا جس کا افسانہ طویل ہے اس میں بیچارے کچھ سادہ لوح ابتداء میں پھنس گئے لیکن اہل علم کو معلوم ہے کہ شاہ ولی اللہ کے تحقیقی طرز عمل نے اس تحریک کو ہندوستان میں زیادہ پھلنے پھولنے نہیں دیا۔ ولی اللہی مکتب خیال کے علماء کی کوششوں کا آج یہ نتیجہ ہے کہ "شیئٌ من صدٍ من قلیل" کے سوا اب عمل بالحدیث کے مدعیوں کی آبادیاں اپنے اندر اور کچھ نہیں رکھتیں۔

اس سلسلہ میں حضرت کی کتابیں انصاف عقد الجید، حجۃ اللہ البالغہ کے بعض ابواب تفہیمات الٰہیہ کی بعض تفہیمات، ازالۃ الخفاء کی بعض ضمنی چیزیں اور سب سے زیادہ موطا کی شرحوں نے حدیث فہمی کا معیار پیش کیا ہے اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی جو راہیں اشاروں اشاروں میں شاہ صاحب نے اہل فہم کے سامنے کھولی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ آج حنفیت "علی بصیرۃ من ربہ" ان ہی بنیادوں پر قائم ہے[1]

ایک بڑی دانش مندی شاہ صاحب نے یہ بھی فرمائی کہ حنفی فقہ کے ساتھ ساتھ آپ نے درسی طور پر شافعی فقہ کے مطالعہ کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ اپنے مسلک کی تشریح میں ایک موقع پر اپنے کو "الشافعی درساً" جو فرمایا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہے جو جانتے ہیں کہ حنفی اور مالکی فقہ کی حیثیت اسلامی قوانین کے سلسلہ میں تعمیری فقہ کی ہے اور شافعی و حنبلی فقہ کی زیادہ تر نوعیت ایک تنقیدی فقہ کی ہے۔ حنفیوں کی فقہ کو مشرق میں اور مالکیوں کی فقہ کو مغرب میں چونکہ عموماً حکومتوں کے دستور العمل کی حیثیت سے تقریباً ہزار ہا سال سے زیادہ مدت تک استعمال کیا گیا۔ اس لئے قدرتاً ان دونوں مکاتیب خیال کے علماء کی توجہ زیادہ تر جدید حوادث و جزئیات

[1] اس موقع پر ناظرین سے میں سفارش کروں گا۔ کہ جناب مفتی عبد اللطیف رحمانی سابق صدر شعبہ دینیات جامع عثمانیہ حال صدر شعبۂ اسلامیات جامعہ اسلامیہ علی گڑھ کی کتاب "تذکرۂ اعظم" کا مطالعہ کریں۔ مفتی صاحب نے شاہ صاحب کی چیزوں کو اس میں بڑے سلیقہ سے جمع کر دیا ہے۔ ۱۲ م

تفریعات کے ادھیڑ بن میں مشغول رہی۔ بخلاف شوافع اور حنابلہ کے کہ بہ نسبت حکومت کے ان کا تعلق زیادہ تر تعلیم و تعلم، درس و تدریس اور تالیف و تصنیف سے رہا۔ اس لئے عموماً تحقیق و تنقید کا وقت ان کو زیادہ ملتا رہا۔ بہر حال یہ افسانہ تو دراز ہے مجھے کہنا یہ ہے کہ فقہ اور اسلامی قوانین کا تعلق ان کے سرچشموں یعنی کتاب و سنّت سے ہے۔ جو چاہتے ہیں کہ یہ تعلق مسلسل زیادہ تر و تازہ حالت میں رہے۔ اُن کے لئے شاہ صاحب کا یہ طریقۂ عمل کہ شوافع اور حنابلہ کی فقہ اور ان کے ادبیات کا بھی مطالعہ جاری رکھیں۔ بہت کچھ مفید ثابت ہو سکتا ہے یا کم از کم حدیث کے درس میں خصوصیت کے ساتھ فقہاء امصار کے خلافیات اور ان کے وجوہ و دلائل کے بیان کرنے سے مسائل فقہ میں زندگی باقی رہتی ہے۔ ہر مذہب کا پیرو اُن علل و اسباب سے واقف رہتا ہے جن کی روشنی میں اس کے امام نے اپنی رائے قائم فرمائی ہے نیز چونکہ اُس کے ساتھ دوسرے آئمہ مجتہدین کے دلائل و وجوہ بھی اس کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر جاہلی حمیت کا زہر ان میں پیدا ہونے نہیں پاتا۔ "عقد الجید" میں شاہ صاحب نے آئمہ مجتہدین کے قیاسی نتائج کے متعلق بجائے اس نظریہ کے کہ حق ان میں سے ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس خیال کو جو ترجیح دی ہے کہ سب ہی حق پر ہیں تو فروعی اختلافات کی اہمیت کے سارے قصے ہی کو ختم فرما دیا ہے اس باب میں شاہ صاحب کے مباحث قابل دید ہیں۔ جس قسم کا اجمال

میرے سامنے پیش نظر ہے۔ اس کے لحاظ سے گنجائش نہیں ورنہ اُن چیزوں کا ذکر کرنا چاہئے کہ لوگ اس کا عام طور پر مطالعہ کریں۔ اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

(۲)

صوفیاء عصر اور تصوّف کی اصلاح

دوسرا ذخیرہ آپ کی کتابوں کا وہ ہے جس میں مشائخ زمانہ اور تصوف عصر کو آپ نے جو نکالنے کی کوشش کی ہے۔ تصوّف کا کتنا ہی حصّہ خالص اسلامی ہے۔ اور زمانہ کی ضرورتوں سے جس طرح متکلمین اسلام نے وقتاً فوقتاً غیروں کی چیزوں کو اپنی کتابوں میں شریک کر لیا تھا حتی کہ شرح مقاصد و مواقف میں عنصریات و کائنات الجو تک کے مباحث درج ہو گئے ہیں۔ اسی طرح تصوّف میں بھی اجنبی عناصر کا اضافہ مختلف وجوہ سے جو ہوتا رہا ہے۔ اپنی مختلف کتابوں خصوصاً الطاف القدس ہمعات سطعات (۹) وغیرہ میں اسی کی آپ نے تفصیل بیان فرمائی ہے۔ تصوف کے متعلق بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے ہندوستان میں اس کے خلاف شاہ ولی اللہ ہی نے قلم بغاوت اٹھایا۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آج جبکہ یورپ تحقیق و ریسرچ کے نام سے اسلامی چیزوں کو غیروں کی طرف مختلف شاطرانہ چابکدستیوں سے منسوب کرنے میں منہمک ہے۔

اگر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقی کتابیں اس وقت ہمارے پاس نہ ہوتیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس دجّالی ہنگامہ میں تصوف کا اسلام سے دور کا بھی رشتہ باقی رہ سکتا تھا؟

یورپ زدوں کا ایک بڑا گروہ باوجود اس کے بھی جاہلوں کو جو بہکا رہا ہے کہ اسلامی صوفیہ کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے بلکہ مصری اشراقیوں، عیسائیوں، صابیوں، یونانیوں، ایرانیوں اور آخر میں ہندوستانی یوگیوں سے مختلف چیزیں لے لے کر مسلمان صوفیوں نے تصوف کی عمارت کھڑی کی ہے۔

خدا جزائے خیر دے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو مختلف کتابوں میں مختلف پیرایوں سے آپ نے اسلام کے حقیقی تصوف اور اجنبی اجزاء کو جدا کر کے دکھایا ہے اور اس سلسلہ میں تو آپ نے اتنا کام کیا ہے۔ کہ جن جن چیزوں کا تصوف سے محض برائے نام تعلق تھا مثلاً جھاڑ پھونک تعویذ وغیرہ اس کے متعلق بھی آپ نے مستقل کتابیں تالیف فرمائیں۔ "القول الجمیل" اور "حزب البحر" کی شرح وغیرہ اسی سلسلہ کی چیزیں ہیں۔ اس طرز عمل کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ جس طرح نمبر ایک کی کتابوں سے حنفی و شافعی اختلافات کی شدّت کم ہوتی ہے۔ ان کتابوں سے ملّا اور صوفی کے جھگڑوں کا بشرطیکہ انصاف سے کام لیا جائے خاتمہ ہو جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے تصوف کے مسائل کو خالص اسلامی تعبیروں میں پیش کر کے "مولویوں" کی اس بھڑک کو مٹا دیا ہے جو ان بیچاروں

میں صوفی وصوفیت کے متعلق پائی جاتی ہے۔

(۴)

شیعہ سنی نزاع کے متعلق شاہ صاحب کا کام

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ہندوستان میں پہلے تورانی سنی، پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشدد سنی روہیلوں کی شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنن و تشیع کے سلسلہ میں عجب افراط و تفریط کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں بھی بڑا کام کیا۔ بڑی محنت سے ہزارہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات "ازالۃ الخفا" میں ایسے دل نشین طریقہ سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ تو اسی کے ساتھ ان غالی سنیوں کی شدت و تیزی میں بھی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو محض اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب کیوں بیان کئے یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہاء حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا۔ ان پر بھی شیعیت کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں ——— اور اس کے لئے بجائے مناظرے اور مجادلے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی۔ جس سے بہت سے فتنوں کا سدباب ہو گیا۔ مولوی شبلی نے اس کی پیروی میں "الفاروق" لکھی جو زیادہ تر

(۴)

یونانی فلسفہ کے بجائے ایمانی فلسفہ

اسی سلسلہ میں شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کے ان معقولی علماء کی اصلاح کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ لفظی گورکھ دھندوں میں مبتلا تھے۔ آپ نے بجائے اوہام وخرافات کے قرآن وحدیث کے کلیات سے خود ایک فلسفہ تیار کیا اور جو لوگ ذہنی تمرین وتشحیذ کے لئے لایعنی خیالات میں وقت ضائع کرتے تھے۔ ان کے لئے شاہ صاحب نے فکر وغور کا ایک بڑا میدان پیش کر دیا۔ اس سلسلہ میں آپ کی سب سے بہتر کتاب "الخیر الکثیر" ہے۔ نیز حجۃ اللہ والبدور البازغہ کے اکثر مباحث کا رخ بھی اسی نصب العین کی طرف ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب کے سامنے ہندوستان کی وہ مرعوب طبائع بھی ہیں جو میر باقر داماد اور صدرا شیرازی وغیرہ ایرانی لفاظوں کے بقبقوں اور طمطراقوں سے متاثر ہو کر اپنی جگہ پر گویا کانپ رہے تھے۔ شاہ صاحب کی بعض کتابوں میں میر باقر وغیرہ کی عبارتوں کی جو جھلک نظر آتی ہے۔ تو میں اس کو کوئی اتفاقی واقعہ نہیں سمجھتا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ آپ نے قصداً اس طرز عمل کو اختیار کیا ہے۔ اور مقصود وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔

مغربی الحاد کے زہر کا تریاق اور امروزہ شبہات کا پیشگی جواب

پانچویں چیز جو مجھے شاہ صاحب کے خدمات میں نظر آتی ہے ممکن ہے کہ لوگوں کو اس باب میں مجھ سے اختلاف ہو۔ لیکن بہرحال مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے بعد ہندوستان میں مذہب اور مذہبی امور کے متعلق شک وارتیاب کا جو دَور آنے والا تھا شاہ صاحب کے کاموں کا ایک بڑا حصّہ اس سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ اور البدوُر البازغہ میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سوالات آئندہ پیدا ہونے والے ہیں۔ ان کا جواب پہلے سے تیار کرکے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے مسلمانوں کو سپرد کر رہے ہیں۔ جیسا کہ مَیں خود لکھ چکا ہوں شاہ صاحب کے زمانہ تک انگریزی حکومت کا اثر دلّی تک نہیں پہنچا تھا۔ لیکن جب بنگال اور مدراس میں ان کے قدم جم چکے تھے۔ اور اپنے اسی اقتدار واختیار کی قوت کو محسوس کرکے عیسائی مذہب کے پادری بطارقہ مغربی خیالات کو کسی نہ کسی شکل میں ملک میں پھیلانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ عوام کو ان کا احساس نہ ہُوا ہو۔ لیکن کوئی تعجب نہیں کہ شاہ صاحب تک اس کی لہریں پہنچی ہوں۔ ماسوا اس کے جب حجۃ اللہ کے دیباچہ میں وہ خود یہ فرماتے ہیں:۔

بینا انا جالس ذات یوم بعد صلوٰۃ العصر متوجہا الی اللہ	کہ اس حال میں کہ ایک دن عصر کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف

اذ ظہرت روح النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغشیتنی من فوقی بشیء خیل الی انہ ثوب القی علی ونفث فی روعی فی تلک الحالۃ انہ اشارۃ الی نوع بیان للدین و وجدت عند ذالک فی صدری نورا لم یزل ینفسح کل حین۔

توجہ کرکے بیٹھا ہؤا تھا۔ اچانک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک ظاہر ہوئی اور مجھے اوپر سے اس نے ڈھانک لیا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا مجھ پر کوئی کپڑا اڑھا دیا گیا ہے اسی کیفیت میں میرے اندر یہ بات پھونکی گئی کہ دین کی تشریح کے ایک خاص طریقہ کی طرف مجھے اشارہ کیا جا رہا ہے۔ میں نے اپنے اندر اس حال میں ایک روشنی پائی جو لمحہ بہ لمحہ پھیلتی چلی جاتی تھی۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد کا جو یہ فقرہ ہے کہ شاہ صاحب کو یہ محسوس ہؤا کہ:۔

ان الشریعۃ المصطفویۃ اشرفت فی ھذا الزمان علی ان تبرز فی قمص سابغۃ من البرھان۔

مصطفوی شریعت کے لئے وقت آگیا ہے کہ برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کرکے اسے میدان میں لایا جائے۔

آئندہ انگریزی عہد میں وساوس و اوہام اور شکوک و شبہات کے جو سیاہ بادل امنڈنے والے تھے۔ اگر ان کی طرف اس میں اشارہ نہیں

ہے تو بتایا جائے کہ حجۃ اللہ کی تصنیف کے بعد انگریزی عہد کے سوا ایسا کون سا دور آیا جس میں ضرورت تھی کہ اسلامی شریعت کو دلیل و "برہان" کے پیراہنوں میں آراستہ کر کے پیش کیا جائے۔ بہر حال میرا خیال ہے۔ اور یہ خیال شاہ صاحب کی کتابوں سے پیدا ہوا ہے کہ جو کچھ ہونے والا تھا اور مسلمانان ہند پر جو افتاد پیش آنے والی تھی۔ کسی نہ کسی ذریعہ سے شاہ صاحب کو اس کی اطلاع ہو چکی تھی۔ اور اپنے تصنیفی کاروبار میں ان کے سامنے جہاں اور مقاصد و اغراض تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آنے والے خطرات کے انسداد کی بھی انہوں نے اپنی کتابوں میں پوری کوشش کی ہے اور میں سمجھتا ہوں وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جوں جوں نئی روشنی کی تاریکی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی جلائی ہوئی علمی شمع کی قیمت اسی نسبت سے بڑھ رہی ہے۔ مغربی الحاد و زندقہ کے زہر کا تریاق شاہ ولی اللہ کا کلام ہے۔ اب یہ ایک ایسی مسلم بات ہو گئی ہے کہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ مصر اور اب تو عرب و ٹرکی، ایران و افغانستان سب ہی کو اس کا احساس ہو رہا ہے۔ اور بحمد اللہ ان تمامی اسلامی ممالک میں شاہ صاحب کی کتابیں کافی مقبولیت حاصل کر رہی ہیں۔ چونکہ میں سر دست صرف ولی اللہی کارناموں کی ایک اجمالی فہرست بتا رہا ہوں اس لئے مزید گفتگو کی گنجائش نہیں۔ انشاء اللہ اگر تفصیل کا موقعہ کبھی ملا تو یہ دکھایا جا سکتا ہے۔ کہ آج جو کچھ پوچھا جا رہا ہے۔ سب کے

جواب سے ولی اللہ القطب الحکیم کا قلم مدت ہوئی کہ فارغ ہو چکا ہے۔

(۶)

قرآن و حدیث کے تراجم کی بنیاد

اور سب سے بڑا کام کم از کم میرے ناچیز خیال میں شاہ صاحب کا یہ ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہندوستان میں قرآن و حدیث کے ترجمہ کی بنیاد بڑی جرأت اور ہمت سے کام لے کر بالآخر ڈال دی تھی۔ اگرچہ خود انہوں نے فارسی میں قرآن کا بھی ترجمہ کیا۔ اور حدیث کی قدیم ترین کتاب موطا مالک کا بھی ترجمہ فارسی ہی میں کیا۔ کہ ان کے زمانہ تک غالباً اردو عام طور سے لکھنے پڑھنے کی زبان نہیں بنی تھی۔ جو بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے وہ فارسی ہی میں لکھتے پڑھتے تھے۔ لیکن جوں ہی کہ اردو نے قدم آگے بڑھایا اور اس راہ میں اس نے بڑی تیزی دکھائی۔ تو محض اس لئے کہ شاہ صاحب کا نمونہ فارسی میں موجود تھا۔ آپ کے صاحبزادوں میں سے حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے بامحاورہ اردو میں اور شاہ رفیع الدین صاحب نے لفظی ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل فرمائی۔

یہ بات کہ ان حضرات کو ترجمہ کرنے کا خیال اپنے والد کے ترجمہ ہی کی بنیاد پر ہوا موضح القرآن میں اس کے متعلق شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں:-

"بندے عاجز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح

ہمارے بابا صاحب بڑے حضرت شیخ ولی عبدالرحیم
صاحب کے بیٹے سب حدیثیں جاننے والے ہندوستان
کے رہنے والے نے فارسی زبان میں قرآن کے
معنے آسان کر کے لکھے ہیں۔ اسی طرح اس عاجز
نے ہندی زبان میں قرآن شریف کے معنے لکھے ہیں۔

اور ان دونوں حضرات کے بعد پھر اس وقت تک اردو میں قرآن بلکہ حدیث کے بھی جتنے ترجمے ہوئے یا آئندہ ہوں گے کم از کم ہندوستان کی حد تک اس سنت حسنہ کے تسنن کا سہرا حضرت شاہ ولی اللہ رح ہی کے سر بندھتا ہے۔ قرآن و حدیث کے ترجمہ سے مسلمانوں کو خصوصاً ایسے زمانہ میں جب اسلام سے ان کا دنیوی اور حکومتی تعلق باقی نہیں رہا۔ جس کی وجہ سے مسلمان تو مسلمان نا مسلم بھی اسلامی زندگی کی اتباع میں فخر محسوس کرتا تھا۔ ایسے زمانہ میں ان ترجموں نے ہم مسلمانوں کے اسلام و ایمان کی حفاظت میں کیا کام کیا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ کرنا آسان نہیں ہے اور خواہ میری یہ خوش اعتقادی قرار دی جائے یا جو کچھ بھی سمجھا جائے۔ میں تو ایسا سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں بھی شاہ صاحب کو اس مصیبت کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ ہو چکا تھا جس میں انقلاب حکومت کے بعد بیچارے مولوی اور مشائخ مبتلا ہونے والے تھے۔

میرا اشارہ اس طریقۂ عمل کی طرف ہے جسے اس زمانہ کے ارباب تشکیک و الحاد نے اسلام کے خلاف بڑی چالاکی سے اختیار کیا ہے وہ

چاہتے ہیں کہ اسلام کی کسی تعلیم کا انکار کریں۔ لیکن ڈرتے ہیں۔ کہ عام مسلمانوں میں اس سے برہمی پیدا ہو گی یا کم از کم صاف انکار اگر کر دیا جائیگا تو عوام ہمارے قبضہ سے نکل جائیں گے۔ اس لئے "مولوی کا مذہب" ایک لفظ تماشا گیا ہے۔ اور ہر وہ چیز جو واقعی قرآن یا حدیث کی ہوتی ہے مولوی کی طرف منسوب کر کے اس کا انکار کر دیا جاتا ہے۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم نے مولوی کے خیال کا انکار کیا ہے۔ قرآن کا انکار نہیں کیا ہے حد یہ ہے کہ آج جنّت و دوزخ، حور و ملائکہ، شیاطین وغیرہ ایسے حقائق کا علانیہ انکار کیا جا رہا ہے۔ جن کے ذکر سے قرآن معمور ہے لیکن سادہ لوحوں کو کتنی دیدہ دلیری سے یہ باور کرا دیا جاتا ہے۔ کہ ان چیزوں کا ثبوت کہیں بھی قرآن میں نہیں۔ بلکہ یہ غبی کند فطرت مولوی ان کا قائل ہے الغرض اس پردہ میں قرآن کے جس عقیدے سے چاہا جاتا ہے۔ انکار کر دیا جاتا ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اگر اس وقت شاہ ولی اللہ قرآن و حدیث کے ترجمہ کی بنیاد ڈال کر نہ چلے جاتے اور اس وقت بھی قرآن عوام کی دسترس سے عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے بالکل باہر ہی ہوتا تو بیچارہ "مولوی" اس مغالطہ کا کیا جواب دے سکتا تھا صبر و سکون کے ساتھ الحاد و بے دینی کے ان طمانچوں کو برداشت کرتا رہے اس کے لئے اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا۔

لیکن بحمد اللہ شاہ ولی اللہ ایک ایسا کام کر کے چلے گئے ہیں۔ کہ جو

نہیں سمجھنا چاہتے ان سے تو بحث نہیں لیکن واقعی جو حقیقت کے طالب ہیں اُن کے لئے ــــــ "مولوی کے مذہب" ــــــ کا بھانا جال اب بیکار ہو چکا ہے۔ قرآن تمہاری زبان میں بہ شکل ترجمہ موجود ہے۔ خود پڑھ جاؤ۔ اور پڑھنے کے بعد خود انصاف کر سکتے ہو۔ کہ مثلاً آج جس جنت و دوزخ، حور و غلماں، اشجار و انہار کا دار آخرت میں انکار کیا جا رہا ہے۔ یہ کسی غریب مولوی کی بات کا انکار ہے یا براہِ راست قرآن کا انکار ہے۔

غرض یہ ایک بڑی پُرفریب دجالیت تھی جس کا قلع قمع کم از کم انصاف پسندوں کی حد تک ہو چکا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو انحطاط و ناقدری کے اس زمانہ میں بیچارے مولویوں کے لئے بھی قرآن و حدیث کے یہ تراجم آج اکسیر کا کام دے رہے ہیں عربی مدارس میں ٹوٹی پھوٹی ہمتوں والے طلبہ آج جو کچھ پڑھتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان میں ایسے بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو بغیر ترجمہ کی مدد کے قرآن یا حدیث کا پورا مطلب خود سمجھ سکتے ہوں اگر یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ نیم فیصدی مولویوں کی آبرو محض ان ہی ترجموں کی بدولت بچی ہوئی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ بعض زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اللہ کے بندے اپنے مالک کے براہ راست مخاطب بننے کی سعادت سے محروم تھے یا براہ راست اپنے رسولؐ کے ملفوظات و ارشادات کے سمجھنے سے معذور تھے۔ اس نعمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اُن تراجم کی بدولت اب

وہ بھی اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور خود ان آنکھوں سے بغیر کسی مولوی عالم کے واسطہ کے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کر رہے ہیں اور جیسا کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے کہ

"بتلانے والے بہتیرا بتائیں۔ جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے۔ ویسا کوئی نہیں بتا سکتا۔ اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے۔ کسی کے کلام میں نہیں۔" [1]

درحقیقت جو منافع ان تراجم کے پڑھنے سے پڑھنے والوں کو حاصل ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ وہ لاکھ مولوی ملا کی زبان سے ہم سنیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ترجمہ پڑھنے والے عوام میں ایسے کتنے ہیں جنہوں نے انہی ترجموں کی مزاولت سے آہستہ آہستہ عربی زبان سے ایسا لگاؤ پیدا کر لیا کہ براہ راست خود کلام اللہ ان کی سمجھ میں آ رہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے کارناموں میں ترجمہ کی خدمت کو میں سب سے بڑی خدمت قرار دیتا ہوں۔

اس وقت چونکہ سرسری فہرست کی حیثیت سے اس کا تذکرہ مقصود ہے۔ اس لئے بالفعل اسی پر بس کرتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں آپ کی ان شش گانہ خدمات قیمہ پر الگ الگ مقالہ میں چاہتا ہوں کہ بحث کروں۔ اور اسی سلسلہ میں ایک مقالہ تراجم کا بھی

---

[1] مقدمہ موضح القرآن از شاہ عبدالقادرؒ۔ ۱۲

ہو گا۔ خود شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ کے متعلق کیا ارقام فرمایا ہے اور کن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اس کام کو آپ نے انجام دیا۔ نیز ترجمہ کے ساتھ قرآن کے حاشیہ پر بزبان فارسی آپ نے مختصر لفظوں میں جو جو لہر پارے بکھیرے ہیں اور "الفوز الکبیر" وغیرہ رسائل میں تفسیر کے جو اصول آپ نے وضع فرمائے ہیں۔ ان سب کا تذکرہ تراجم ہی کے اس مقالہ میں انشاء اللہ کیا جائے گا۔

شاہ صاحب کے اُن شش جہتی کارناموں پر اجمالی نظر

واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی حیرت انگیز فقید النظر کوششوں کی جو نوعیت ان شش جہتی کارناموں میں نظر آتی ہے۔ ان میں ہر ایک بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے کہ ایک کیا اگر علماء کی کوئی جماعت بھی ان سے عہدہ برآ ہونا چاہتی تو جتنی کامیابی حضرت شاہ صاحب کو ان میں سے ہر ایک شعبہ میں ہوئی ہے۔ کسی ایک شعبہ میں بھی اتنا کامیاب ہونا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے قرآنی آیات کی جن مشکلات کو حل کیا ہے۔ قرآن فہمی کے متعلق جن کلیات کی انہوں نے خود تاسیس فرمائی ہے۔ حدیث فقہ کے باہمی تعلقات کو صحیح تاریخی وثائق کی روشنی میں جس طرح انہوں نے حل فرمایا ہے۔ پھر خصوصیت کے ساتھ "علم اسرار الدین" کے سلسلہ میں حدیث اور فقہ کے تقریباً تمام ابواب میں جن حقائق کو رموز کو انہوں نے

بے نقاب کیا ہے۔ اس باب میں واقعہ یہ ہے کہ ان کے اس دعویٰ کی کوئی تردید نہیں کر سکتا۔ کہ :۔

اسرار حدیث و مصالح احکام و ترغیبات و سائر آنچہ حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم از خدائے تعالےٰ آوردہ اند و تعلیم فرمودہ اند و آں فنے است کہ پیش از یں فقیر مضبوط تر از سخن ایں فقیر کسے آنرا نہ کردہ است باوجود جلالت آں فن، اگر کسے را دریں حرف شبہ باشد گو کتاب قواعد بہ بیں کہ شیخ عزیز الدین آنجا چہ جہد ہا کردہ بعشر عشیر ایں فن فائز نشدہ۔ صفحہ ۱۹۶

انفاس

حدیث کے اسرار اور اسلامی احکام و قوانین کی مصلحتیں اور ترغیبات کی حکمت اور وہ ساری باتیں جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور جن کی آپ نے تعلیم دی ہے ان سب کے اسرار و رموز کا بیان کرنا ایک مستقل فن ہے۔ اس فقیر سے پہلے جتنی پختہ بات میں نے کہی ہے کسی سے یہ نہ بن آیا۔ اس فن کے بلندی مقام کے باوجود اگر کسی کو میرے بیان میں شبہ ہو تو چاہیئے کہ کتاب "قواعد" کو دیکھے۔ شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اس میں کیا کچھ کوشش نہیں فرمائی ہے۔ مگر اس فن کے عشر عشیر تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔

اسی طرح فن معارف و حقائق اور تصوف کے متعلق جن تحقیقی مباحث تک وہ پہنچے ہیں نیز اہل سنت والجماعت کے عقائد کی تشریح اور تطبیق

منقول بر معقول کے سلسلہ میں انہوں نے جو خدمتیں انجام دی ہیں۔
جیساکہ خود ارشاد فرماتے ہیں :۔

عقائد قدماء اہل سنت بدلائل و حجج اثبات کردو آں را از خس و خاشاک معقولیاں پاک ساخت و بوجہے مقرر نمود کہ محل بحث نہ ماند۔	قدماء اہل سنت کے عقائد کو دلائل وبراہین کی روشنی میں جس طرح ثابت کیا گیا ہے اور معقولیوں کے خس وخاشاک سے جیسا ان کو پاک کیا ہے۔ اور ایسے طریقہ سے

ان کی بنیاد قائم کی ہے کہ اب بحث ومباحثہ کی ان میں گنجائش ہی باقی نہ رہی۔

ماسوا اس کے انہوں نے قرآنی نصوص اور نبوی ارشادات کی روشنی میں دو مستقل فن جو ایجاد کئے ہیں۔ جن کی تعبیران ہی کے الفاظ میں یہ ہے۔ یعنی ایک تو "علم کمالات اربعہ یعنی ابداع وخلق وتدبیر و تدلی با این عرض وطول"۔

"اور دوسرا علم ان ہی کی اصطلاح میں ——
"علم استعداد نفوس انسانیہ بجمیعہا وکمال و مآل ہر کسے"

شاہ صاحب کا ان دونوں علوم کے متعلق دعویٰ ہے اور بجا دعویٰ ہے کہ —— "ایں ہر دو علم جلیل اند کہ پیش از یں فقیر کسے برگرد آں نہ گشتہ"۔

نیز شاہ صاحب نے علم کلام اور تصوف کے نظری حصہ کے مباحث کو مخلوط کرکے ایک نیا "فلسفہ" تیار کیا اور ایسا "فلسفہ" جس کو "فلسفہ" قرار دینا

میرے خیال میں اس کی تحقیر ہے۔ کیونکہ اس باب میں ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ایسی کسی چیز کو اسلامی کلام اور اسلامی تصوف میں وہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ جس کی تائید قرآن و حدیث اور آثار صحابہؓ و سلف صالح کی شہادتوں سے نہ ہوتی ہو۔ خود فرماتے ہیں کہ اس قسم کے تمام مسائل میں حق تعالےٰ نے ان کو

توفیق تشئید آں بہ کتاب و سنت و آثار صحابہ دادند۔ بر تمیز آنچہ علم دین ست منقول از حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم و آنچہ مدخول ست و محرف و آنچہ سنت است و آنچہ ہر فرقہ بدعت کردہ است افادہ ساختند۔ (انفاس)	اس بات کی توفیق دی کہ کتاب و سنت و آثار صحابہ سے اسکی بنیادوں کو مستحکم کریں نیز وہ علم دین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور جو دین میں باہر سے چیزیں داخل ہو گئی ہیں۔ ان دونوں میں تمیز کا جو سلیقہ اور یہ کہ ان میں کون سی

باتیں تحریفی ہیں۔ کون کون سی چیز سنت ہے اور اسلام کے مختلف فرقوں نے کن نئی بدعتوں کو شریک کیا (ان تمام امور کا انکشاف جیسا شاہ صاحب نے کیا۔ شاید ہی کسی نے کیا ہو۔)

الغرض اس قسم کے مختلف الاطراف والجوانب مباحث ہمہ کو انہوں نے اپنی چھوٹی بڑی کتابوں اور رسالوں میں جو جمع کیا ہے جن کی تعداد "حیات ولی" کے مصنف نے (۱۵) بتائی ہے۔ اگرچہ اسی کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے :-

"آپ کی تالیفات کے سلسلہ میں اور بھی بہت سی کتابیں ہیں جو قدیم کتب خانوں میں موجود ہیں۔ مگر ہم نے صرف ان ہی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو مطبوع ہو کر شرق سے غرب تک نہایت وقعت کے ساتھ مشہور ہو چکی ہیں۔"

شاہ صاحب کے طرزِ انشا میں زبانِ نبوّت کی جھلک

اور پھر یہی نہیں کہ ان کی توجہ اپنی ان کتابوں میں محض معنی پر رہی ہے۔ بلکہ عربی زبان میں انہوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی جو ان کا مخصوص اسلوب ہے پوری پابندی کی ہے۔ شاہ صاحب نے عربی انشاء و ادب کا جو نیا قالب تیار کیا ہے یہی نہیں کہ ہندوستانی مصنفین میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔ بلکہ جہاں تک میری محدود رسائی کا تعلق ہے مَیں نہیں جانتا کہ آغازِ اسلام سے اس وقت تک کسی اسلامی علاقہ کے ارباب تصنیف نے اس کو اختیار کیا ہے۔ شاہ صاحب کے اس "اسلوب بدیع" کی کیا خصوصیتیں ہیں اس کے لئے بھی ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ لیکن مختصر لفظوں میں شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر صاحب "جوامع الکلم النبی الخاتم" صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ گفتگو کی پیروی کی ہے۔ حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار ان ہی لغات اور ان ہی

محاوروں میں کریں جو لسانِ نبوّت اور زبانِ رسالتؐ سے خاص تعلق رکھتے ہیں ۔ اور اس میں خدا نے ان کو خاص مہارت عطا فرمائی ہے ۔ ان سے پہلے تو کسی کو عبارت کے اس ڈھنگ کی طرف توجہ ہی نہیں ہوئی ۔ لیکن ان کے بعد بھی اس کی تقلید آسان نہیں ہے ۔ حدیث کے بعد ان کی عبارت میں قرآنی طرز تکلّم کا بھی اثر ہے ۔ لیکن قرآن سے زیادہ اس باب میں وہ حدیث ہی کے متبع نظر آتے ہیں اور اسی چیز نے ان کی کتابوں کے رنگ کو عربی زبان کے تمام دوسرے مصنّفین سے ممتاز کر دیا ہے ۔ فارسی میں اگرچہ شاہ صاحب نے اگرچہ کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے ۔ کم از کم اس میں ان علماء کے لئے درس عبرت ہے جو اپنے زمانہ کی عام طریقۂ انشاء و کتابت میں لکھنے پڑھنے کو اپنی علمی شان سے ایک گری ہوئی بات خیال کرتے ہیں ۔ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز کی کتابوں کو پڑھئے اور اس زمانہ کے بڑے بڑے ارباب انشاء کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیجئے ۔ مشکل ہی سے ان حضرات کی عبارات ان سے دب سکتی ہیں ۔

شاہ صاحب کے اس سارے کام کی مدّت

لیکن یہ سارا کام کتنی مدت میں انجام پایا شاید ہی کسی نے اس پر غور کیا ہو ۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سفرِ حج سے پہلے کا جو حصہ ہے ۔ اس میں تصنیف و تالیف کا بظاہر آپ نے کچھ کام نہیں کیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کو اس کا

خیال بھی نہ تھا۔

والد ماجد یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی وفات کے وقت آپ سترہ سال کے تھے۔ اسی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد اپنے والد کے پرانے مدرسہ رحیمیہ میں درس تدریس کا کام تقریباً ایک قرن تک انجام دیتے رہے۔ خود فرماتے ہیں۔ کہ :۔

بعد از وفات حضرت ایشاں دوازدہ سال کمی بیش بدرس کتب دینیہ و عقلیہ نمودہ دو ز ہر علمے خوض واقع شد۔ (انفاس)	حضرت والد کے انتقال کے بعد کم و بیش بارہ سال تک دینی اور عقلی علوم کی کتابوں کا درس دیتا رہا اور ہر علم میں غور و فکر کا مذاق پیدا ہوا۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ قریب قریب انتیس سال کی عمر تک شاہ صاحبؒ کا بجائے تالیف و تصنیف کے زیادہ تر درس و تدریس سے ہی تعلق رہا۔ اسی زمانہ میں یکایک سفر حجاز کا سودا سر میں سمایا۔ فرماتے ہیں :۔

بعد ازاں دوازدہ سال شوق زیارت حرمین محترمین در سر افتاد۔	اس بارہ سال کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق سر میں سمایا۔

سنہ ۱۱۴۳ و سنہ ۱۱۴۴ و سنہ ۱۱۴۵ یہ تین سال اسی سفر کی نذر ہوئے جس میں تقریباً چودہ مہینے حرمین شریفین میں قیام کا موقعہ میسر آیا۔ شاہ عبدالعزیز کا بیان گزر چکا ہے کہ :۔

والد ماجد چہاردہ ماہ در حرمین بودند — والد ماجد چودہ مہینے حرمین میں رہے

(ملفوظات صـ ۹۳)

اور باقی مدت آمد و رفت میں صرف ہوئی۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب کو دو حج ملے۔ ایک اس وقت جب حجاز پہنچے۔ اور دوسرا اس وقت جب واپسی کے قصد سے عرب سے روانہ ہونے والے تھے۔

اس حساب سے حضرت کی عمر کے تینتیس ۳۳ چونتیس ۳۴ سال اُن ہی مشغلوں میں ختم ہو گئے۔ آپ کی پوری عمر کتنی ہوئی۔ اس میں اگرچہ تھوڑا سا اختلاف ہے "حیاتِ ولی" کے مصنف نے گو یہ لکھا ہے کہ

شاہ صاحب کی عمر کے بارہ میں اختلاف

"جناب شاہ ولی اللہ عمر کے تریسٹھ سال مرحلے طے کر چکے تو چند روزہ خفیف سی بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۱۷۶ھ میں عازم سفر آخرت ہوئے۔" صـ ۳۱۶

لیکن اس کے برخلاف ملفوظات عزیزیہ کے جامع نے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے:۔

شاہ صاحب کی ولادت و وفات شاہ عبدالعزیز کی زبانی

عمر شریف شصت و یک ۶۱ سال و چہار ماہ شد، چہارم شوال تولد گشت و در بست و نہم محرم وفات یافت تاریخ تولد چہارم ماہ شوال، چہار شنبہ سـ ۱۱۱۴ـہ بود۔ تاریخ وفات:۔

"او بود امام اعظم دیں۔"
۱۱۷۶

ودیگر تاریخ :-

ہائے دل یروزگار رفت بست نہم محرم وقت ظہر"
۲۹ ۱۱

(ملفوظات عزیزیہ صث ۴)

تاریخوں کے ملانے سے جیسا کر یوں بھی چاہیئے شاہ عبدالعزیز ہی کے بیان کی توثیق ہوتی ہے۔ بہرکیف میرا مقصد تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کی عمر جب کل اسٹھ سال چار مہینے مانی جائے تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اس اسٹھ میں سے تقریباً تینتیس ۳۳ چونتیس ۳۴ تو انہی مشغولیتوں میں بسر ہو گئی اب کل ستائیس اٹھائیس سال کی مدت رہ جاتی ہے جس میں وہ سارا کام انجام پایا ہے جسے دنیا شاہ ولی اللہ کا کام سمجھتی ہے۔ بلکہ اُسی کے ساتھ مرحوم حضرت امیر شاہ خاں صاحب جو ولی اللہی خانوادہ کے گویا "رواپہ" تھے۔ اگر ان کے اس بیان کا بھی اضافہ کر لیا جائے کہ

"دہلی میں نجف علی خاں کا تسلط تھا جس نے شاہ ولی اللہ صاحب کے پہنچے اترواکر ہاتھ بیکار کر دیئے تھے تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون نہ تحریر کر سکیں"۔

(امیر الروایات ص۳۴)

اگرچہ اب تک اس واقعہ کی تاریخی شہادت مجھے میسر نہیں آئی لیکن امیر شاہ کا بیان کم از کم میرے نزدیک خود ایک زندہ شہادت ہے۔ پھر چونکہ یہ نہیں معلوم کہ ناگوار سانحہ حضرت کے ساتھ کس وقت پیش آیا۔ اس لئے کوئی معین مدت تو مقرر نہیں کی جاسکتی لیکن بقیہ ستائیس اٹھائیس

سال والی مدت کا محاملہ اس بنیاد پر اور گھٹ کر رہ جاتی ہے۔
اتنی قلیل مدت میں ایسے عجیب و غریب گوناگوں کام کیسے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بن آئے؟ یہ یقیناً محل حیرت ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بہت کچھ دخل ان کی خداداد فطرت اور خاص دل و دماغ کو بھی ہے۔ بھلا جس شخص کی ختنہ اور جس کا ختم قرآن ساتھ ساتھ ہوا ہو جیسا کہ خود فرماتے ہیں:۔

در سال ہفتم حضرت والد بزرگوار بر نماز ایستادہ کردند و بروزہ داشتن فرمودند و تطہیر نیز دریں سال واقع شد و چناں در خاطر ماندہ کہ آخر ہمیں سال قرآن عظیم ختم کردم۔ (انفاس صـ۱۹۴)

عمر کے ساتویں سال میں والد بزرگوار نے مجھے نماز پر کھڑا کیا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا اور ختنہ بھی اسی سال میں واقع ہوئی اور خیال ایسا ہوتا ہے۔ کہ اسی سال کے آخر میں قرآن مجید بھی میں نے ختم کیا۔

اور دس سال کی عمر میں جو شرح ملا تک پہنچ گیا ہو۔ اور کس طرح پہنچا ہو کہ مطالعہ کی قوت بھی پیدا ہو چکی ہو۔ فرماتے ہیں:۔

در سال دہم شرح ملا می خواندم و راہ مطالعہ فی الجملہ کشادہ شد۔

میں دسویں سال شرح ملا پڑھ چکا تھا۔ فی الجملہ اسی وقت سے مطالعہ کی راہ مجھ پر کھلی۔

اور ٹھیک عمر کے پندرھویں سال میں باضابطہ دستار فضیلت جس کے

سرپر بندہ گئی ہو۔ جیسا کہ اُن ہی کا بیان ہے کہ :۔

بالجملہ از فنون متعارفہ بحسب رسم این دیار پانزدہم فراغ حاصل شد	خلاصہ یہ ہے کہ تمام متداول علوم اس ملک کے درس میں جن کا رواج ہے ان سے پندرہویں سال فراغت حاصل ہو گئی۔

ان علوم متداولہ میں صرف درس نظامیہ کی کتابیں ہی داخل نہیں ہیں۔ بلکہ ان عام کتابوں کے سوا طب اور تصوّف کی ایک نہیں چند چند کتابیں چھوٹی بڑی بھی شریک ہیں بلکہ شاید علم خواص الاسماء وغیرہ کے طرز کی بعض چیزیں بھی اپنے والد سے آپ نے پڑھ لی تھیں اور پھر سترہ سال کی عمر سے ہر قسم کے علوم و فنون عقلی کا درس دینا شروع کر دیا تھا ظاہر ہے کہ یہ باتیں ان کی خاص دماغی اور ذہنی قابلیت پر دلالت کرتی ہیں۔

عرب بھی جو وہ گئے تو اس میں شک نہیں کہ وہاں کے اہل علم و فضل کی صحبتوں سے کافی فائدہ ان کو پہنچا۔ اور سب سے بڑی چیز جو وہاں سے لائے وہ حدیث کی سند تھی۔ کیونکہ گو ہندوستان میں بھی قبل سفر حجاز کے اپنے والد سے پوری مشکوٰۃ اور بخاری کا کچھ حصہ پڑھ چکے تھے لیکن صحاح اور صحاح کے سوا دوسری حدیث کی کتابوں کی سند آپ کو عرب ہی سے حاصل ہوئی۔ لیکن خود ان کے بعض جلیل القدر اساتذہ بلکہ آپ کے سب سے بڑے استاذ حدیث علامہ طاہر بن ابراہیم کردی ہی فرماتے تھے :۔

یسند عنی اللفظ و کنت	مجھ سے وہ لفظوں کی سند لیتے ہیں

اصحح المعنی منہ۔ (الیانع الجنی) — اور میں ان سے حدیث کے معنی کی تصحیح کرتا ہوں۔

بلاشبہ یہ ساری باتیں اُن کی فطری ذہانت و ذکاوت پر دلالت کرتی ہیں اور شاہ عبدالعزیز صاحب سے منقول بھی ہے۔ فرمایا کرتے تھے "مثل والد ماجد شخصے کم نظر آید"۔ حافظہ کے متعلق ان ہی کی شہادت یہ ہے کہ "مثل والد ماجد حافظ ندیدہ ام"۔ ص۱۱

ایک اور خاص بات شاہ عبدالعزیز نے ان کے متعلق یہ بھی بیان کی ہے کہ ــــ "مریض ہم کم می شدند"۔ ص۲۰۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ صاحب کی ان علمی خدمات و مجتہدات میں ان کی فطری خصوصیتوں کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔

لیکن جو کام جتنی قلیل مدت میں ان سے بن پڑا ہے اور ایسا کام جس کے اکثر حصے کے وہ موجد ہیں۔ ان کی کتابوں سے اگر ان "باکورات" و "بدائع" کا انتخاب کیا جائے جن کے ابتداع و ابتکار کا فخر صرف ان کے نوک خامہ کو حاصل ہے تو بلامبالغہ ہزارہا ہزار سے وہ متجاوز ہو سکتے ہیں تو کیا شاہ صاحب کی اس عبقریت اور نابغیت میں صرف ان کے دل و دماغ کو دخل ہے۔ ممکن ہے کہ لوگ ایسا ہی خیال کرتے ہوں۔ خصوصاً اس زمانہ میں "جینیس" کا ایک لفظ تراش لیا گیا ہے اور جب کسی شخص کے کام کے متعلق اس قسم کی مدہوش کن اور حیرت انگیز اعجوبہ طرازیوں کا تجربہ ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس "فن" کا فلاں شخص "جینیس" ہے

اگر شاہ صاحب کے متعلق کوئی وثیقہ مجھے نہ ملا ہوتا تو شاید میں بھی کچھ اسی قسم کی بات کہہ کر یہ سن کر چپ ہو جاتا۔ لیکن الحمد للہ کہ سفرِ حجاز سے پہلے اور سفرِ حجاز کے بعد کی شاہ صاحب کی دونوں زندگیوں اور ان کے کارناموں میں جو نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اسی کی تہہ میں جو حقیقی سبب کارفرما ہے وہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے۔ جو سمجھا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدائے مضمون میں عرض کیا تھا کہ حجاز پہنچ کر شاہ صاحب نے ایک خواب دیکھا تھا اور ایسا خواب کہ اگر اس کی تعبیر پوری نہ ہوتی تو آج ہندوستان کی تاریخ وہ نہ ہوتی جو اس وقت ہے۔ تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ اس خواب میں شاہ صاحب کو حضرت السلطان الغازی للابدالی اور ان کی فیصلہ کن جنگ جو مرہٹوں سے ہوئی اس کا نقشہ دکھایا گیا تھا

شاہ صاحب کی اُن محیر العقول علمی خدمات کا اصل راز

ساری دنیا جانتی ہے کہ "پانی پت" کے میدان میں اگر اس دن قدرت ابدالی کے حق میں فیصلہ نہ کرتی۔ تو یقیناً ہندوستان میں مرہٹوں کی حکومت قائم ہو چکی ہوتی اور مرہٹوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کا جو ہنجار ہوتا۔ وہ یوں بھی ظاہر ہے۔ پیشتر اس قوم کے جن نصب العینوں کا تھوڑا بہت ذکر آ چکا ہے ان سے بھی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لوگ کچھ ہی خیال کریں لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ ان ہی مرہٹوں کے مظالم سے تنگ آکر جو حجاز بھاگا تھا اس کو اس فتنہ کے قلع قمع کی بشارت اس خواب کے ذریعہ سے

دی گئی تھی۔ اور جس طرح کفر کے اس استیصال کی خبر سے وہ مبشر ہوئے ٹھیک اسی سفر میں ان کو ایک اور مژدہ اور کامیابی کی خوشخبری سے سرفراز فرمایا گیا تھا۔ جس کا ذکر شاہ صاحب نے حالانکہ اپنی ایک نہیں بلکہ متعدد کتابوں میں کیا ہے۔ لیکن لوگ اس کو پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں حالانکہ جہاں تک مَیں خیال کرتا ہوں شاہ صاحب کی ساری انقلابی زندگی اور حجاز سے واپسی کے بعد ان سے اسلام کی جو عظیم خدمتیں بن آئیں ان سب کا قصہ اسی وقت ختم کر دیا گیا تھا۔ واقعہ اسی وقت ہو چکا تھا صرف اس کا ظہور ہندوستان آکر ہوا۔ میرا اشارہ شاہ صاحب کے اس مشہور خواب کی طرف ہے جس کا ذکر حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں بھی کیا گیا ہے۔ اور فیوض الحرمین و درثمین دونوں کتابوں میں بھی ہے۔ مَیں پہلے اس خواب کو درثمین سے بجنسہ ان ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں فرماتے ہیں:۔

حضرت حسین رضؓ نے شاہ صاحب کو اپنے جدامجد رسول اللہ صلعم کا قلم عطا فرمایا اور حضور کی چادر آپ کو اڑھائی گئی۔ کان الحسین والحسن علیہم السلام نزلا فی بیتی وبید الحسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ قلمہ قد انکسر لسانہ وبسط الیّ یدہٗ لیعطینی وقال ھذا قلم

گویا حسین اور حسن علیہما السلام میرے گھر تشریف لائے ہیں۔ اور حسن علیہ السلام کے دست مبارک میں ایک قلم ہے۔ جس کی زبان (نوک) ٹوٹی ہوئی ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ تاکہ وہ قلم مجھے عطا فرمائیں اور فرمایا کہ یہ

جدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال حتی یصلحہ الحسین فلیس ما اصلحہ الحسین کما لم یصلحہ فاخذہ الحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ واصلحہ ثم ناولنیہ فسررت بہ ثم جیئ برداء مخطط فیہ خط اخضر وخطا بیض فوضع بین یدیہما فرفعہ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ وقال ھذا رداء جدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم البسنی فوضعتہ علی راسی تعظیما وحمدت اللہ تعالیٰ۔

قلم میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے مگر پھر آپ بولے کہ حسین اسے درست کرلیں (تب دونگا) اور فرمایا کہ حسین جیسا درست کرسکتے ہیں۔ کوئی دوسرا اتنا درست نہیں کرسکتا۔ پھر حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس قلم کو لے لیا۔ اور درست فرمایا۔ میں اس (انعام) سے بہت مسرور ہوا۔ پھر ایک چادر لائی گئی۔ جس پر دھاریاں بنی ہوئی تھیں ایک دھاری سبز ایک سفید، پہلے یہ چادران دونوں حضرات کے سامنے رکھی گئی پھر حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے اٹھایا اور فرمایا کہ یہ چادر میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ پھر وہ چادر مجھے اڑھادی گئی۔ تب میں نے تعظیماً اس کو اپنے سر پر رکھ لیا۔ اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

شاہ صاحب کے اس خواب کی تشریح اور تعبیر

شاہ صاحب نے یہ کیا خواب دیکھا؟ ظاہر ہے کہ اس خواب میں چند اجزاء ہیں (۱) حسنین صاحب کا تشریف لانا (۲) حسن علیہ السلام کے ہاتھ میں ایک ایسے قلم کا ہونا جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ (۳) شاہ صاحب کو دینے کا ارادہ فرمانا مگر پھر حضرت حسین علیہ السلام سے اس قلم کو بنوانا (۴) اور یہ فرمانا کہ "فلیس ما اصلحہ الحسین کما اصلحہ" یعنی جیسا قلم حسین علیہ السلام بنا سکتے ہیں وہ قلم اور جوان کا درست کیا ہوا نہ ہو، برابر نہیں ہو سکتے (۵) بن جانے کے بعد اس قلم کو شاہ صاحب کے سپرد فرمانا (۶) اس قلم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب فرمانا (۷) پھر شاہ صاحب کو ایک چادر جو "برد یمانی" کے صفات سے موصوف ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے عطا فرمانا (۸) اس کا اڑھا دینا۔

حضرت حسنین رضؓ کی زندگیوں کا انطباق شاہ صاحب کی زندگی پر

میں نے ہر جزو کو الگ الگ کر کے اس لئے لکھ دیا ہے تاکہ غور کرنے میں آسانی ہو۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس خواب سے میری سمجھ میں جو کچھ آیا ہے وہی اس کی واقعی تعبیر بھی ہے۔ لیکن بہر حال میرا ذہن اس خواب سے جن امور کی طرف منتقل ہوا ہے۔ اب اسے عرض کرتا ہوں۔

حضرات حسنین علیہ السلام کی اصل خصوصیت یہی ہے کہ ملت اسلامیہ

جب شدید زغہ میں آ ئی ہے تو ان میں بڑے صاحب نے اپنی صلح کی روش سے اور چھوٹے صاحب نے مقابلہ اور مقاتلہ کے طریقہ سے اس فتنہ کا مقابلہ کیا۔ پھر کیوں نہ سمجھا جائے۔ کہ اس وقت ہندوستان میں اسلام جن نرغوں میں گھر گیا تھا۔ اسی کے مقابلہ کے لئے شاہ صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ اشارہ ادھر تھا کہ شاہ صاحب سے جس مقابلہ کا کام لیا جائے گا اس میں صلح و جنگ دونوں طریقوں کو دخل ہوگا۔ شاہ ولی اللہ نے آنے والے خطرات کے مقابلہ میں مذکورۂ بالا حس شش جہتی کا نا موں کو پیش کیا۔ بہ ظاہر تو اس کی صورت جنگ کی نہیں۔ بلکہ ایک مصلحانہ مقابلہ کی تھی کیونکہ یہ تلوار سے نہیں بلکہ قلم کی جنگ تھی۔ لیکن اس جہاد میں شاہ صاحب اور ان کے خاندان والوں کو دشمنوں کی جانب سے جو اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں کربلائی قربانیوں کے نشانات نہ تھے ابھی گزر چکا کہ نجف خاں نے شاہ صاحب کے پونچے اتروا دیئے تھے۔ صاحب الیانع علامہ محسن البہاری رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ کہ جس وقت شاہ صاحب نے فقہ و حدیث کے صحیح تعلقات کی تنقیح فرما کر کتابیں شائع کیں۔ جن میں ظاہر ہے کہ "اس تقلید جامد" کی مخالفت کی گئی تھی۔ جس میں عموماً سرحدی پٹھان اور روہیلے مبتلا تھے۔ تو قدرتاً ان پر شاہ صاحب کی باتیں سخت شاق گزرتی تھیں۔ دلی اس وقت ان ہی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ بقول مولانا محسن[1] کے کہ "غنم کلب" کے بالوں سے

[1] یہ مولانا محسن بہار کے شمالی حصہ ترہت کے رہنے والے تھے۔ خزر جپک ضلع مونگیر

زیادہ ان کی تعداد تھی۔ یہ لوگ ہر طرح سے شاہ صاحب کے درپئے آزار ہوئے لیکن وہ لکھتے ہیں :۔

لم یصد شیء من ذالک	ان لوگوں کی مخالفتیں شاہ صاحب
مما کان علیہ من ترجیح	کو اس طرز عمل سے نہ روک سکیں
ما وافق من اقوال	جو ظاہر سنن و آثار کے مطابق فقہا
الفقہاء ظواہر السنن	کے اقوال کو ترجیح دینے کا تھا اور
والاثار ومن بیان ما صفا	اس سلسلہ میں جو مسلک صاف
موردہ من ذالک عما	ستھرا تھا اس کو مکدر طریقہ سے
ترنق فکان یصرح بہا بین	وہ جدا کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ
ظہرانیہم نصحاً للامۃ	ان متصلب سخت پٹھانوں کے
ووفاء لعہد اللہ الذی	درمیان علانیہ اپنے اس مسلک کا
واثق بہ العلماء ۔ (الیانع)	اظہار فرماتے تھے مقصد امت کی

بہی خواہی تھی۔ اور خدا کے اس عہد کو پورا کرنا تھا۔ جس کا علماء سے وعدہ لیا گیا ہے۔

فتحپوری کی مسجد میں قتل کے ارادہ سے شاہ صاحب کا جو محاصرہ کیا

(بقیہ ص ۲۷۵) میں ان کا عجب کتب خانہ اب تک موجود ہے اگرچہ بڑا حصہ اس کا قرعہکی قربانی کے جھگڑے میں ہندوؤں کے ہاتھ برباد ہو گیا۔ مولانا محسن نے ہندوستان میں تحصیل علم کے بعد حجاز اور دوسرے اسلامی ممالک میں بھی کچھ پڑھا تھا خاکسار کو آپ سے اور آپ کے خاندان سے قرابت قریبہ کے تعلقات ہیں۔

گیا اس کا ذکر بھی گزر چکا۔ پھر اس کے بعد آپ کے خاندان پر جو مظالم توڑے گئے اس کا اندازہ شاہ عبدالعزیز کی بعض روائتوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً ملفوظات میں ہے:۔

چوں در شہر کہنہ بودم بسیار از رفضاؤ فسّاق و برادران حسود و تکلیفہا می کشیدم — جب ہم پرانی دلی میں تھے۔ تو رافضیوں اور فاسقوں اور حسد کرنے والے بھائیوں سے بہت تکلیفیں مَیں نے اٹھائیں۔

پھر ان "تکلیفہا" میں سے ایک تکلیف کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

بعضے قریب خانۂ ما تعزیہ بر سقف می کردند و تبرا و سب شتم مے نمودند — بعض لوگ میرے گھر کے پاس اپنے کوٹھے اور بالاخانوں پر تعزیے رکھتے اور تبرا بکتے (اور خلفاء ثلثہؓ کو) گالیاں دیتے۔ اور اس طرح مجھے ایذا پہنچاتے۔

یہ تو خیر شیعوں کا سلوک تھا۔ "فساق" کا برتاؤ کیا تھا اس کی مثال یہ ہے کہ:۔

روزے فاجرہ شراب خوردہ وقت تراویح در عین قرأت قرآن شعر حافظ شیراز — ایک دن ایک فاحشہ عورت نے شراب پی کر تراویح کے وقت عین قرات قرآن کے درمیان حافظ شیرازی کا یہ شعر گانا شروع کر دیا۔

در کوئے نیک نامی مارا گذر ندادند گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را
در کوئے نیک نامی مارا گذر ندادند گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

خواندو بعضے دفہا و آوازہا می زوند کہ قرأت مشتبہ شود۔ (ملفوظات ص۵۲)

اور بعض لوگ ڈھول تاشے بجاتے اور شور پکار بلند کرتے تاکہ میری قرأت میں گڑبڑ پیدا ہو۔

شاہ صاحب کے خاندان پر کربلائی مصائب

اور یہ تو خیر معمولی باتیں ہیں، ہیں حضرت قبلہ امیر شاہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تو جس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے۔ سن کر کلیجہ دہل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ نہ ہی نجف خاں جس نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروائے تھے اسی نے

"شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین کو اپنے قلمرو سے نکال دیا تھا اور یہ ہر دو صاحبان مع زنانوں کے شاہدرہ تک پیدل آئے تھے"۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی مستورات کے ساتھ میدان کربلا میں جو فاضحات ناگفتہ بہ پیش آئے تھے کیا اس کی جھلک اس واقعہ میں نہیں پائی جارہی ہے۔ شاہ ولی اللہ کی بہوئیں اور پوتیاں اس بے سروسامانی

لہ مغل دربار کا آخری امیر تھا۔ جس کے بعد ہی لال قلعہ پر غیروں کا قبضہ ہوگیا۔ دراصل یہ شروع میں نواب وزیر اودھ کی وزارت کا دلی میں نائب تھا۔ لیکن بعد کو خود مستقل بن بیٹھا اور آخری ہانڈی حکومت کی اسی کے سر پھوٹی۔ ۱۲

کے ساتھ دلّی سے پیادہ پا آئی ہیں۔ پھر انہی کا بیان ہے کہ شاہدرہ سے زنانوں کی سواری کا نظم تو حضرت مولٰنا فخر رحمتہ اللہ علیہ کی سفارش سے ہو گیا لیکن

"شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو سواری بھی نہ ملی تھی۔ اور شاہ رفیع الدین صاحب تو پیدل لکھنو چلے گئے تھے اور شاہ عبدالعزیز صاحب پیدل جونپور چلے گئے تھے۔"

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امام زین العابدین "بیمار" کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا تھا۔ اسی کا ظل ولی اللہ کے بیمار صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحب میں نہیں ہے۔ ملفوظات میں ہے کہ شاہ صاحب کو بائیس قسم کی بیماریاں تھیں۔ لیکن ظالموں نے رحم نہیں کیا اور دلّی سے پیدل جونپور دوڑا دیا۔ دونوں بھائی سفر میں ساتھ ہوتے تو شاید گونہ تسلّی ہوتی۔ لیکن امیر شاہ خاں صاحب کا بیان ہے کہ

"ان دونوں کو نہ سوار ہونے کا حکم تھا اور نہ ساتھ رہنے کا۔"

خاں صاحب نے اسی سلسلہ میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ

"دو دفعہ روافض نے شاہ عبدالعزیز صاحب کو زہر دیا تھا اور چھپکلی کا ابٹن لگوا دیا تھا جس سے شاہ صاحب کو برص کا مرض ہو گیا تھا۔"

مجھے یاد آتا ہے کہ امیر شاہ خاں صاحب ہی سے میں نے یہ بھی سنا تھا۔ کہ جس وقت شاہ عبدالعزیز پیدل جونپور بھیجے گئے۔ یہ موسم ٹھیک جیٹھ کا تھا۔ سخت لُو کے دن تھے امیر الروایات میں بھی اتنا موجود ہے کہ ا۔

"جونپور کے سفر میں شاہ صاحب کو لُو بھی لگ گئی تھی
جس سے مزاج میں سخت حدّت پیدا ہو گئی تھی۔
جس سے جوانی ہی میں بینائی جاتی رہی تھی اور
ہمیشہ سخت بے چین رہتے تھے۔ ص۴۳"

اور آخر میں تو شاہ ولی اللہ کے پوتے مولانا اسمٰعیل صاحب اور اسی خاندان کے تربیت یافتہ بزرگ حضرت سید احمد بریلوی (رحمۃ اللہ علیہما) نے بالاکوٹ میں جس واقعہ کی تصویر پیش کی۔ اس پر تو کربلا کی ظلّیت کا خاتمہ سی ہو جاتا ہے۔

بہرحال اس خواب میں حسنین علیہما السلام کے دیدار سے شاہ صاحب کا مشرف ہونا۔ محض اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ اس کے بعد حضرت حسن علیہ السّلام کے دست مبارک میں ٹوٹے ہوئے قلم کا ہونا جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدّت سے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام

لہ دارالعلوم دیوبند کے متوسلین میں شاید ہی کوئی ہوگا جو حضرت امیر شاہ خاں سے واقف نہ ہوگا۔ خاکسار پر بڑی نظر عنایت تھی بلکہ ولی اللہی خاندان سے خاص نیاز خاں صاحب ہی کی بدولت ابتداءً حاصل ہوا۔ اور حضرت شیخ الہند کی غلامی و بیعت سے سرفرازی بھی انہی کی بدولت حاصل ہوئی۔ ۱۲۔

دنیا میں ایک بھی قابل ذکر مصنّف پیدا نہیں ہوا تھا۔ تصنیف کا ذوق و شوق تو باقی تھا لیکن کتابوں میں صرف لفظوں کی بھرمار ہوتی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ تاریخ جس کا سرمایہ صرف واقعات ہیں اس کی کتابوں میں بھی ادھر دو تین صدیوں سے یہ آفت آئی ہوئی تھی کہ محض لفظوں کی دھڑا بندی کی جاتی تھی۔ علمار اسلام کے جو تذکرے ادھر تیار ہوئے ان میں دیکھیئے بقول نواب علامہ مولٰنا حبیب الرحمان شروانی سوائے "البحرالعلام والبحرالقمقام" کے ہم قافیہ الفاظ کے سوانح و حالات کی ایک سطر نہیں ملتی۔ بے مائگی میں یہی حال دوسرے علوم و فنون کی کتابوں کا بھی تھا۔ تو میرے خیال میں گویا اسی کی طرف ٹوٹے ہوئے قلم سے اشارہ کیا گیا تھا۔ اور اب یہ "قلم" شاہ ولی اللہ کے سپرد ہو رہا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اصلاح کی راہ میں شاہ صاحب کو جو قلم دیا جا رہا تھا اس میں اشارہ کر دیا گیا تھا کہ حسنی رنگ کے ساتھ ساتھ حسینی واقعات کے تجربے پیش آئیں گے اور یہ جو امام حسن علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "حسین جیسا بناتے ہیں ویسا دوسرا نہیں بنا سکتا" تو اس میں گویا اشارہ تھا کہ ہر چیز سے بے پروا ہو کر صرف حق کی حمایت میں میدان میں کود جانا چاہئے۔ اور میں بیان کر چکا کہ شاہ صاحب نے اس راہ میں کیسی جرأت دکھائی۔ اپنی تصوف کی کتابوں میں جب مشائخ عصر پر وہ تنقید فرماتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ ملک ان ہی لوگوں کے زیر اثر ہے ان کا ایک اشارہ فتنہ کی آگ کو روشن کر دینے کے لئے کافی

ہے۔ لیکن متعدد مقامات پر یہ ارقام فرماتے جاتے ہیں :۔

ہر چند ایں سخن بر بسیارے از صوفیہ زماں دشوار خواہد بود۔ اما مرا کارے فرمودہ اند بر حسب آں می گویم با زید و عمرو کارے نیست۔ (وصیت نامہ ص۵)	ہر چند میری یہ بات اس زمانہ کے صوفیوں پر گراں گزرے گی لیکن مجھے ایک کام کا حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق کہہ رہا ہوں مجھے زید و عمرو سے کوئی سروکار نہیں۔

آخر میں شاہ صاحب کو بڑو یمانی کے نیچے دونوں حضرات لے آئے ہیں یعنی یہ فرماتے ہوئے کہ :۔

ھذا ارداء جدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	یہ میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر ہے ۔

وہ چادر حضرت شاہ ولی اللہ کو اڑھا دیتے ہیں غالباً یہ ادھر اشارہ تھا کہ سب کچھ ہوگا۔ مخالفین بھی ہوں گے دشمن ستائیں گے بھی لیکن زیر سایہ عاطفت نبوت کبریٰ علی صاحبہا الف سلام وتحیہ چونکہ شاہ صاحب کی زندگی گزرے گی۔ اس لئے ردائے محمدیؐ کے سایہ میں پناہ لینے والوں پر انشاء اللہ مخالفین کی کچھ پیش نہ جائے گی اور ان کو خائب وخاسر ہو کر واپس ہونا پڑے گا۔ اور شاہ صاحب کے قلمی آثار کو دنیا میں فروغ ہوگا بلکہ "ٹوٹے ہوئے قلم" کے بعد اسلامی دنیا میں ایک نیا دور تصنیف وتالیف کا شروع ہوگا جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ یہی ہوا خود شاہ ولی اللہ صاحب نے درثمین میں جہاں اس خواب کو نقل فرمایا ہے۔ اس کے بعد آخر میں

فرماتے ہیں :-

فمن یومئذ انشرح صدری التصنیف فی العلوم الشرعیۃ منہ ۲	اسی دن سے میرا سینہ شرعی علوم میں تصنیف کے لئے کھل گیا۔

جس کا صاف اور کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ شاہ صاحب کی آئندہ زندگی میں تصنیفی کوششوں کا جو سلسلہ شروع ہوا۔ اور وہ بڑھا اور اس حد تک بڑھا کہ اب نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر، ترکی، حجاز اور کابل تک کے جامعات و مدارس میں آپ کی کتابیں داخل درس ہیں اور ان ہی ممالک کے مطابع سے آپ کی کتابیں چھپ چھپ کر ہندوستان آرہی ہیں ان تمام کوششوں کی تہہ میں "حقیقی موثر" غیب کی یہی قوت تھی۔

شاہ صاحب کے تجدیدی کارناموں میں فیضِ روح القدس کا دخل

بے شک شاہ صاحب بچپن ہی سے غیر معمولی طبیعت و فطرت کے مالک تھے۔ لیکن آپ کی ان حکیمانہ و مجددانہ کارناموں میں صرف آپ کی طبیعت ہی کو دخل نہیں ہے اور نہ آپ کے والد ماجد و دیگر اساتذہ کی تعلیم و تربیت ہی کا اس کو نتیجہ کہا جا سکتا ہے بلکہ کسی کی نگاہِ انتخاب نے اب شاہ ولی اللہ کو وہ ولی اللہ باقی نہیں رکھا تھا اب شاہ صاحب کی زبان پر کوئی اور بول رہا تھا اور ان کی انگلیوں میں اب کسی اور کا قلم چل رہا تھا۔ ع ۔ سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب ایک دن اپنے والد کے اس خواب کا تذکرہ فرما رہے تھے۔ جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ آخر میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد

حال نسبت و علم تقریر دگرگوں شد۔ — والد کی نسبت باطنی اور علم و تقریر ساری باتوں کی حالت کچھ اور ہی ہو گئی۔

شاہ ولی اللہ کا رنگ اس کے بعد اتنا بدل گیا تھا کہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ ان کے والد کے جو پرانے شاگرد تھے وہ سفر حجاز سے واپسی کے بعد آپ کی حالت کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے تھے کہ پہلی بات ان کی باقی نہیں رہی ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

چنانچہ مستفیضان سابق ہرگز نسبت سابق نمی کردند۔ — چنانچہ جن لوگوں نے شاہ صاحب سے پہلے فیض پایا تھا یعنی شاگرد و مرید، وہ پہلی نسبت کا آپ میں بالکل احساس نہیں کرتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک مصیبت زدہ مسافر حجاز پہنچا تھا اخلاص و صداقت کے ساتھ پہنچا تھا۔ جو رنگ لاکر رہا خود شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ جب مدینہ منورہ کی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تو:۔

دراں میاں بروضہ منورہ حضرت سید البشر علیہ افضل الصلوٰت واتم التحیات متوجہ شدو فیضہا — اس عرصہ میں حضرت سید البشر (علیہ افضل الصلوٰت واتم التحیات) کے روضۂ منورہ کی طرف متوجہ رہتا

یافت۔ (انفاس) | تھا اور اس سے بڑے بڑے فیض حاصل کئے۔

ان ہی "فیضہا" کی شرح و تفصیل میں شاہ صاحب نے ایک مستقل کتاب "فیوض الحرمین" ارقام فرمائی ہے شاہ صاحب کے ساتھ کیا کیا نوازشیں ہوئی ہیں۔ ان کی تفصیل اسی کتاب میں پڑھنا چاہئے۔ مجھے تو اس وقت صرف یہ کہنا ہے کہ مرہٹوں کے فتنہ کا ازالہ اور آئندہ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق جو سوالات پیدا ہوئے تھے اور پیدا ہونے والے تھے۔ ان کے جو جوابات اور ان مشکلات کا جو حل شاہ ولی اللہ کے قلم نے پیش کیا یہ درحقیقت انہی مدنی "فیضہا" کا کرشمہ تھا ــــ اور شاہ صاحب نے اس فیوض الحرمین ہی میں اپنے متعلق جو یہ دعویٰ کیا کہ :ـــ

مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سلوک کا راستہ طے کرایا اور

سلکنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وربانی بیدہ فانا اویسیہ و تلمیذہ بلا واسطۃ بینی وبینہ۔ (فیوض الحرمین ص ۲۳)	اپنے دست مبارک سے میری تربیت فرمائی۔ اس لئے میں آپ کا اویسی ہوں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بلا واسطہ شاگرد ہوں۔

تو اس کی حقیقت بھی ان فیوض پر غور کرنے سے کھل جاتی ہے۔

سفر حجاز کے بعد شاہ صاحب کی زندگی کا خاص موڑ بہرحال

شاہ صاحب میں جو نشہ حجاز میں بھر اگیا تھا۔ اس سے مست ہوکر جب وہ ہندوستان واپس ہونے لگے ہیں۔ اس وقت ان کے دل میں کن کن ولولوں کا زور تھا اور کن حوصلوں کو لے کر چلے تھے۔ انفاس العارفین کے ایک واقعہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنے سب سے بڑے شیخ الحدیث علامہ ابوطاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی سے جب آخری دفعہ رخصت ہونے کے لئے ملنے تشریف لے گئے تو خود فرماتے ہیں:-

ایں فقیر برائے وداع نزدیک شیخ ابوطاہر رفت ایں بیت بر خواند۔	فقیر رخصت ہوتے وقت شیخ ابوطاہر کے پاس حاضر ہوا۔ اور یہ شعر میں نے پڑھا۔

نسیت کل طریق کنت اعرفہ
الا طریقا یؤدینی الی ربعکم

ہر راہ میں بھول گیا بجز اس راہ کے جو تمہارے گھر تک مجھے پہنچائے۔ کسی ایسے حال سے معمور ہوکر شاہ صاحب نے یہ شعر پڑھا کہ:-

بمجرد شنیدن آں بکا بر شیخ غالب آمد و بغایت متاثر شد۔	سننے کے ساتھ شیخ پر گریہ طاری ہوا اور بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

الغرض ہر چیز سے دست بردار ہوکر صرف ایک "نصب العین" کو سامنے رکھ کر انہوں نے ہندوستان کی زمین پر قدم رکھا وہ سالہا سال کا پرانا اور موروثی ذوق درس و تدریس قطعاً غائب ہوچکا تھا۔ مدرسہ

چونکہ باقی تھا اور اس کو باقی رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کے نام پر طلبہ آیا کرتے تھے۔ لیکن اب جو کام پیش نظر تھا اس کے ساتھ "معلم الصبیانی" کی زق زق بق بق کی گنجائش نہ تھی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ بجائے خود پڑھانے کے

حضرت والد ماجد از ہر یک فن شخصے تیار کردہ بودند طالب ہر فن با وے می سپردند	والد ماجد نے ہر فن کے لئے ایک شخص تیار کر لیا تھا۔ جس فن کا جو طالب ہوتا اس کو اسی فن کے استاد کے سپرد فرما دیتے۔

غالباً "دوازدہ سالہ تدریس" کے یہ تیار کئے ہوئے لوگ تھے۔ اب مدرسان ہی کے سپرد تھا اور خود اپنے لئے کیا مشغلہ باقی رکھا تھا۔ کل تین چیزیں۔ جیسا کہ شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے:۔

خود مشغول معارف گوئی و نویسی بودند۔ و حدیث مے خوانیدند۔	خود معارف کے بیان کرنے اور لکھنے کا کام کرتے۔ اور صرف حدیث پڑھاتے۔

کس ذوق کس شوق، کس اہتمام و استغراق کے ساتھ حجاز سے واپسی کے بعد ان تین مشغلوں میں شاہ صاحب نے زندگی گذاری۔ اس کے متعلق بھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی عجیب و غریب شہادت ہے۔ فرماتے ہیں:۔

بعد اشراق کہ مے نشست تا	اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے۔ تو

دوپہر زانو بدل نمے کرد وعارش نمے نمود وآب دہن نمی انداخت۔
دوپہر تک نہ زانو بدلتے نہ کھجلاتے نہ دہن مبارک سے تھوک پھینکتے۔

ولی اللہی فیوض کی وسعت ونوعیت

شاہ صاحب ۱۱۴۶ھ میں حجاز سے ہندوستان واپس ہوئے اور اپنے کام میں مشغول ہوئے ٹھیک چار سال بعد دلی کی زمین پنادر گردی کا وہ آسمان ٹوٹا جس کے خونی افسانوں سے اب تک ملک کے کوچہ وبرزن معمور ہیں۔ لیکن شاہ صاحب پر جو دہن سوار تھی اس حادثہ کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں پڑا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نادرہی کے چلے جانے کے بعد محمد شاہ نے طلبہ کے ہجوم وکثرت یا کسی اور سبب سے بجائے پرانی دلی کے نئے شہر میں خود بلا کر مدرسہ کے لئے وہ حویلی عطا کی جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور اسی مدرسہ سے علم کا وہ سیل جرار جاری ہوا۔ کہ آج عرب وعجم میں کم از کم علم حدیث کا جو زور شور ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی انتہا حضرت شاہ ولی اللہ ہی کے مخلصانہ مجاہدوں پر ختم ہوتی ہے مولنٰا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ سے امیر شاہ خاں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ سفر حج میں حضرت کا جہاز یمن کے ساحل کے کسی بندرگاہ پر ٹھہر گیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی چند دن رکا رہے گا حضرت نانوتوی کو کسی نے خبر دی کہ اس بندرگاہ کے شہر میں ایک کہنہ سال معمر بزرگ محدث رہتے ہیں۔ ان کی ملاقات کو حضرت تشریف لے گئے۔ مل کر مولنٰا نانوتوی ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور درخواست کی۔ کہ

حدیث کی سند اجازت عطا ہو۔ اس پر محدث صاحب نے پوچھا تم کس
کے شاگرد ہو؟ انہوں نے اپنے استاد مولانا عبدالغنی مجددی کا نام لیا۔
محدث صاحب ناواقف تھے پوچھا عبدالغنی کس کے شاگرد تھے بولے
ملا شاہ اسحاق کے۔ شاہ اسحاق سے بھی وہ ناواقف تھے۔ پوچھا وہ کس
کے شاگرد تھے، کہا شاہ عبدالعزیز صاحب کے۔ شاہ عبدالعزیز کا نام سن
کر محدث صاحب نے کہا ان کو میں جانتا ہوں اور اس کے بعد فرمایا۔

ایک یمنی محدث کی شہادت

شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے۔ جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں ہے۔ یونہی جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں ہے وہاں جنت نہیں ہے۔ منہ

اور یہ تو یمن کے ایک عالم محدث کی شہادت ہے اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ [illegible] عبدالرشید [illegible] مرحوم کا قول ذرا زیادہ تفصیل سے نقل کروں [illegible] کی آمان [illegible] حضرت [illegible] مطلب تمام [illegible] تھی —

علامہ رشید [illegible]

ہندوستانی علماء کی توجہ سے زندہ ہے۔

ولو عنایۃ اخواننا علماء
الھند بعلوم الحدیث فی ھذا
العصر لقضی علیھا بالزوال
من امصار الشرق فقد
ضعفت فی مصر والشام
والعراق والحجاز منذ القرن
العاشر للھجرۃ حتی بلغت
منتھی الضعف فی اوائل
ھذا القرن الرابع عشر
وانی لما ھاجرت الی مصر
سنۃ ۱۳۱۵ رأیت خطباء
مساجد الازھر وغیرہ
یذکرون الاحادیث فی
خطبھم غیر مخرجۃ ومنھا
الضعیف والمنکر والموضوع و
مثلھم فی ھذا الوعظ و
المدرسون ومصنفوا الکتب
وکنت انکر ذلک علیھم کما

ہمارے ہندوستانی بھائیوں میں جو
علماء ہیں اگر حدیث کے علوم کے ساتھ
اس زمانہ میں ان کی توجہ نہ ہوتی۔ تو
مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا
کیونکہ مصر، شام، عراق، حجاز میں دسویں
صدی ہجری سے یہ علم ضعف کا
شکار ہو چکا تھا۔ اور چودھویں صدی
کے اوائل تک ضعف کی آخری منزل
پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے جب ۱۳۱۵ھ
ہجری میں مصر ہجرت کی تو ازہر کی
مسجدوں کے خطیبوں کو اور دوسری
مسجدوں کے خطیبوں کو دیکھا۔
کہ اپنے خطبوں میں ایسی حدیثیں
پڑھتے ہیں جن کا پتہ نہیں۔ ان
میں ضعیف، منکر، اور موضوع و
جعلی حدیثیں بھی ہوتی ہیں اور
یہی حال واعظوں، مصنفوں،
مدرسوں سب کا تھا۔ میں ان کو

بدأت بانکار مثلہ علی — ڈر گیا تھا ایسا کہ اپنے وطن طرابلس
اھل بلدی طرابلس — میں بھی یہی کرتا۔
قبلھم۔ (مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ)

یہ مصر کے ایک فاضل جلیل اور چودھویں صدی کے ایک ناقد بصیر کی گواہی ہے۔ جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ کسی ایک ملک ہی میں نہیں بلکہ مصر و شام، عراق، حجاز جو اسلام کے گہوارے ہیں ان سب میں دسویں صدی سے مسلمانوں کا یہ حال ہو گیا تھا۔ اور صرف کسی ایک طبقہ ہی میں جہل کی حکومت قائم نہیں تھی۔ بلکہ دین و علم کے جو جو گروہ خادم تھے یعنی واعظ، خطیب، مدرسین و معلمین حتیٰ کہ مصنفین و مؤلفین سب ہی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ نبوت کے علم سے بے پروا ہو چکے تھے۔ غلط سلط غیر معتبر اور گڑھی ہوئی حدیثوں پر لوگوں کا دار و مدار رہ گیا تھا شاہ ولی اللہ صاحب کو علم نبوت (حدیث) کے اسی حال کا تمثیلاً گویا ایسے قلم کی شکل میں جو ا جس کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی تھی اور جب مصر و حجاز، عراق و شام جیسے ممالک علم حدیث سے دسویں صدی ہجری تک بے تعلق سے ہو گئے تھے۔ تو پھر خراسان، ترکستان، ایران وغیرہ جہاں ایک مدت سے اس "علم" کا چرچا مٹ چکا تھا ان کی جو حالت ہوگی وہ ظاہر ہے۔

علامہ رشید کا یہ اقرار کہ "اگر علماء ہند کی توجہ اس علم کی طرف نہ ہوتی تو اس علم کا مشرقی ممالک میں خاتمہ ہو جاتا" سب جانتے ہیں کہ علماء ہند

کی نہیں بلکہ براہ راست حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کا اعتراف ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں حدیث کا جو کچھ بھی چرچا پچھلے دنوں ہوا۔ سب کی انتہا بالآخر حضرت شاہ صاحب ہی کے وجود با جود پر ہوتی ہے گویا شاہ صاحب کو حسنین علیہما السلام نے جو قلم عطا فرمایا تھا یہ دراصل اسی قلم کے کارناموں کا اقرار ہے کیونکہ شاہ صاحب کے وہ سارے علمی مجاہدات جن کے اثر سے بالآخر اس ملک میں حدیث کے فن کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ان کا تعلق اسی قلم سے ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا اسی قلم کے ملنے کے بعد کیا۔ بلکہ عوام تو شاید خواب کے اس قلم کو خواب و خیال نالا قلم خیال کرتے ہوں گے لیکن جس شخص کا خود ذاتی مشاہدہ تھا کہ ان کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم کو خواب ہی میں دربار رسالت پناہی سے محاسن (ڈاڑھی مبارک) کے دو بال عطا ہوئے تھے۔ شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ حالت بیداری میں یہ دونوں موئے مبارک ان کے والد کو ملے جو ایک مدت تک خود ان ہی کے پاس رہے اور جب تبرکات تقسیم ہونے لگے۔ تو

یکے ازاں دو موئی بکاتب حروف	تھا ان دو موئے مبارک میں سے
عنایت فرمودند۔	ایک موئے مبارک کاتب حروف
(انفاس ص۱۴)	کو عنایت فرمایا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیف کی ایک خاص خصوصیت ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے جو یہ بیان فرمائی کہ۔۔

بعد مراقبہ ہر چہ منکشف می رسید می نگاشتند۔ (ملفوظات ص ۳۴)

کہ مراقبہ کے بعد جو چیز کشفی طور پر آپ کو معلوم ہوتی اسے ارقام فرماتے تھے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ "اس مراقبہ" میں شاہ صاحب کا رخ کس طرف ہوتا تھا اور اس سے کیا مقصود تھا۔ ان تصانیف کے لئے آپ کو جس مقام سے قلم ملا تھا، اسی طرف توجہ کر کے بیٹھ جاتے یا خواب والے قلم کو پھر اپنے اندر بیدار کرتے تھے۔ یا اس کے سوا کوئی اور چیز آپ کے پیش نظر تھی۔ بہر حال اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی کتابوں کا ڈھنگ جو نرالا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ان کی تصنیف و تالیف کی ان خاص خصوصیتوں کو بھی ضرور دخل ہے۔ بلکہ شاہ صاحب کی عبارت میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں "جوامع الکلم" کی جھلک جو نظر آتی ہے۔ اس میں بھی قصد سے زیادہ اُن کے اسی طریقہ عمل کو شاید دخل ہو۔

الغرض سفر حجاز سے واپس ہونے کے بعد جیسا کہ اپنے استاد سے رخصت ہوتے وقت فرمایا تھا اور ودالبا اسی کا ترجمہ شاہ عبد العزیز نے یہ فرمایا ہے جو ان کے ملفوظات میں منقول ہے کہ:۔

پدرمن وقت رخصت از مدینہ از استاد خود عرض کرد، او خوش مے شد کہ ہر چہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین یعنی حدیث (ص ۹۳)

کہ میرے والد نے مدینہ منورہ سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے استاد سے عرض کیا اور استاد اس سے بہت خوش ہوئے کہ میں نے جو کچھ پڑھا تھا بجز علم دین یعنی حدیث کے

بھلادیا ؎

من آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

گویا ــــ جو کچھ پڑھا تھا زمانے نے سب وہ ایک دم میں بھلادیا ــ

اب ان کا مشغلہ صرف یہی رہ گیا تھا کہ متوسلین وتلامذہ کے سامنے اسرار و حقائق پر تقریر فرماتے رہتے تھے یا حدیث کا درس دیا کرتے تھے یا لکھتے رہتے تھے اور اس شان کے ساتھ لکھتے رہتے تھے کہ ہر مسئلہ "مراقبہ" کے بعد درج کتاب ہوتا تھا حدیث کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کے درس کا ایک جزو اور بھی تھا جس کا ذکر شاہ عبدالعزیز ہی نے دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ :-

معمول والد ماجد آں بود کہ بعد ختم قرآن حدیث می شروع کردند۔

والد ماجد کا معمول یہ تھا کہ ختم قرآن کے بعد حدیث کا دورہ شروع کراتے۔

جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحاح کا درس جس کا نام اس زمانہ میں "دورۂ حدیث" پڑ گیا ہے۔ اس سے پہلے شاہ صاحب قرآن کا دورہ بھی کرا لیا کرتے تھے۔ اور بغیر تفسیر کے مجرد متن قرآن پڑھانے کی ترویج کم از کم ہندوستان میں شاہ ولی اللہ ہی کی ایجاد ہے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اب مدارس خصوصاً ولی اللہی مدارس میں بھی یہ طریقہ ترک کر دیا گیا۔ اور بعض ان حلقوں تک جنہیں (میں تعمیم) باقی رہ گئی ہے آپ نے وصیت نامہ میں طریقہ تعلیم

کے متعلق جو ایک "نظام نامہ" مرتب فرمایا ہے اُس میں فرماتے ہیں کہ :-

متن قرآن کے درس کے متعلق شاہ صاحب کی ہدایات

قرآن عظیم درس گوشتہ۔ بآں صفت کہ صرف قرآں بخوانند بغیر تفسیر و ترجمہ گویند و در آنچہ مشکل باشد در نحو یا در شان نزول متوقف شود و بحث نماید۔ بعد فراغ از درس تفسیر جلالین را بقدر درس بخوانند درین طریقت فیضہا است

قرآن عظیم کا درس دینا چاہئے اس طریقہ سے کہ صرف قرآن پڑھا جائے یعنی تفسیر کے بغیر صرف متن قرآن اور ترجمہ پڑھایا جائے۔ پھر قرآن کے متن کے متعلق جو دشواری پیش آئے مثلاً نحو کے متعلق یا شان نزول کے متعلق تو رک جانا چاہئے کہ اس کی تحقیق کی جائے پھر جب قرآن ختم ہو جائے۔ تب نصاب تک جلالین پڑھائی جائے۔ اس طریقہ میں بڑے بڑے فیض ہیں۔

واقعہ ہے کہ آج جتنا زور عربی مدارس کے قدیم سلسلوں میں حمد اللہ اور میر زاہد کی عبارتوں کے حل پر دیا جاتا ہے یا نئے مدرسوں میں ادب و انشاء وغیرہ میں سرمارا جاتا ہے اگر اسی وقت کو قرآنی آیات کے حل ہی میں صرف کیا جائے تو جو کتاب صرف مغز ہی مغز ہے اس سے علماء اور طلباء کو کیسے کچھ فیض پہنچ سکتے ہیں۔ تفسیروں کے درس میں عموماً آدمی حق تعالیٰ کے کلام سے ہٹ کر پھر اپنے ہی جیسے انسانوں کی تعبیروں میں اُلجھ جاتا ہے۔ اور انہی کے مشکلات میں اتنا وقت صرف ہو جاتا ہے کہ قرآنی آیات کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا عموماً قرآن کے پڑھانے سے

آدمی پر جن عجیب و غریب حقائق کا انکشاف ہوتا ہے شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کے متعلق بڑے تجربہ کی بات فرمائی ہے کہ :-

مردماں چنانچہ در قرآن متلذذ می شوند در حدیث نہ۔ ما را ہم چنانچہ در قرآن معنے ہائے عجیب و غریب دست مے دہد آدمی باشد در حدیث نہ۔ در حدیث موافق کتب بیان مے کنم۔ (ص)

لوگ جتنا قرآن سے لذت گیر ہوتے ہیں اتنی لذت ان کو حدیث میں نہیں ملتی اور خود ہمارا حال بھی یہی ہے کہ جتنے عجیب و غریب مطالب قرآن میں ہاتھ آتے ہیں اور اس میں آمد معلوم ہوتی ہے۔ حدیث میں یہ بات حاصل نہیں ہوتی۔ حدیث کے درس میں تو وہی بیان کرتا ہوں جو کتابوں میں ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قرآن میں جب تدبر کیا جاتا ہے۔ تو بغیر کتابی امداد کے خود بخود مطالب کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ بخلاف حدیث یا کسی دوسرے فن کے کہ اس کے درس میں عموماً شرح و حواشی کی ہی ریزہ چینی ہوتی ہے۔

شاہ صاحب کے باقیات صالحات

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو کچھ میں لکھنا چاہتا تھا خدا کا شکر ہے کہ وہ لکھا جا چکا۔ اب آپ کے "باقیات صالحات" اولاد امجاد کے مختصر تذکرہ پر اس سلسلہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ سب ہی کو معلوم ہوگا کہ شاہ صاحب قدس سرہٗ کو حق تعالیٰ نے علاوہ اس اولاد کے جو صغر سنی

ہی میں وفات پاکر آپ کے لئے ذخیرہ آخرت بن چکی تھی چار فرزند عطا فرمائے تھے جو فرزندی کے علاوہ آپ کے صحیح جانشین بھی تھے۔ یعنی شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی۔

وفات سے پہلے چاروں صاحبزادوں کی خلافت

شاہ صاحب نے اس دنیا سے جاتے وقت باضابطہ طور پر بھی ان چاروں حضرات کو اپنا جانشین (خلیفہ) بنایا تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے ملفوظات ہی میں ہے کہ وفات سے تھوڑی دیر پہلے:-

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بر سر ہر چہار فرزندان نہادہ بودند۔ آپ نے چاروں فرزندوں کے سروں پہ دستار مبارک رکھ دی تھی یا باندھ دی تھی۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ حضرت نے اپنے چاروں صاحبزادوں کو اپنا خلیفہ و جانشین قرار دیا۔ یہاں سوچنے بلکہ عبرت کی ایک چیز ہے کہ اسی دلی میں ایک دنیادار بادشاہ نے اپنے چند بیٹوں کو اسی طرح دنیا میں اپنا جانشین قرار دیا تھا جیسا کہ مورخ فرید آبادی رقمطراز ہیں کہ:-

"اورنگ زیب نے اپنی زندگی میں بڑے بیٹے محمد معظم کو شمالی ہند اور کابل کی حکومت سونپ دی تھی، وسط ہند گجرات باپ کے چہیتے بیٹے محمد اعظم کے زیر انتظام تھے اور جنوبی ہندوستان شہزادہ کام بخش کے حوالے کر دیا گیا تھا۔"

فرید آبادی اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:-

"اسی انتظام کے مطابق وہ سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم

کرنا چاہتا تھا:

لیکن دنیا کے ان تین بادشاہوں نے ہندوستان اور کابل جیسے وسیع و عریض ملکوں میں اپنے لئے گنجائش نہ پائی۔ اور ہوا اس کے بعد جو کچھ ہوا۔

شاہ صاحب کے چاروں صاحبزادوں کے باہمی تعلقات

لیکن اسی دلّی میں دین کا ایک سردار اپنے تین نہیں بلکہ چار بیٹوں کے سر پر خلافت کی دستار باندھتا ہے پھر دین کے ان چار شہزادوں نے زندگی کس طرح گذاری اس کا اندازہ ان تعلقات سے ہو سکتا ہے جو ان چاروں بھائیوں میں آخر عمر تک باقی رہے۔ بشیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ:

"شاہ عبدالقادر کا کھانا اکبری مسجد سے روزانہ شاہ عبدالعزیز کے گھر سے جاتا تھا۔ وہی اپنے اس متوکل بھائی کے کپڑے بنادیا کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز باوجود بڑے ہونے کے شاہ عبدالقادر کی ولایت کے کس حد تک قائل تھے۔ اس کے متعلق وہی مشہور بات کہ عید کا چاند تیس کا ہوگا یا انتیس کا۔ اس کا پتہ چلانے کے لئے ہمیشہ حضرت شاہ عبدالعزیز رمضان کی پہلی تاریخ کو آدمی بھیج کر دریافت کراتے کہ

"میاں عبدالقادر نے آج کے سیپارے پڑھے ہیں؟" اگر آدمی نے آکر کہا کہ آدھ دو پڑھے ہیں تو شاہ صاحب فرماتے کہ عید کا چاند تو انتیس ہی کا ہوگا۔ یہ بات دوسری ہے کہ ابر وغیرہ کی وجہ سے دکھائی نہ دے اور حجت شرعی نہ ہونے کی وجہ سے ہم رویت کا حکم نہ لگا سکیں۔ (امیر الروایات ص۔۔)

ملّا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ سے شاہ عبدالعزیز کو جو دلی تعلق تھا

اس کا اندازہ بھی اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب شاہ رفیع الدین کو لوگ دفن کر کے فارغ ہوئے اس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک خاص کیفیت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ:

مرا چار رشتہ بود یکے برادر حقیقی بود دوم	رفیع الدین سے میرا چار طرح رشتہ تھا
قبلہ گاہی (حضرت شاہ ولی اللہ) مرا	ایک تو حقیقی بھائی تھے دوسرے میرے قبلہ
بتقریبے داد و گفت کہ فرزند تست سوم	گاہی (والد ماجد) نے ایک تقریب
شیر دایہ من نوشیدہ چہارم شاگرد۔	سے انھیں میرے سپرد کر کے کہا۔ کہ یہ تمہارا

لڑکا ہے۔ تیسرے ہم نے اور انھوں نے ایک ہی دائی کا دودھ پیا تھا۔ چوتھے وہ میرے شاگرد تھے۔

کسی نے اسی سلسلہ میں عرض کیا کہ شاہ رفیع الدین سے اس خاندان کی بڑی علمی عزت تھی۔ شاہ عبدالعزیز نے اس وقت جو جملہ فرمایا۔ وہ سچی اور خالص محبت کی کتنی اچھی تعبیر ہے فرمایا:-

اگر جاہل ہم بودند مرا ہم چناں درد بے	اگر وہ جاہل بھی ہوتے تو مجھے اتنا ہی قدر درد ہوتا۔

جامع ملفوظات نے مولانا رفیع الدین کے جنازے کی کیفیت اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا باوجود نابینا ہونے کے اُن کی چارپائی اٹھانے کی کوشش اور تنہائی ضبط کی کوشش کے باوجود بار بار بلبلا اٹھنا اور فرمانا کہ "چو گریم من بحال تستی ندارم" ایک ایسے درد ناک پیرایہ میں ان حالات کو بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بھائیوں میں مروت و اخلاص کے کیسے مراسم تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ باقی چاروں بھائیوں کی عمر

عجیب ترتیب سے ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز ہی کا قول جامع الملفوظات نے یہ نقل کیا ہے کہ

چاروں صاحبزادوں کی وفات میں عکسی ترتیب

ترتیب عکس در رحلت برادران واقع شد یعنی اول مولوی عبدالغنی کہ خورد ترین ہمہ بودند بعد ازاں مولوی عبدالقادر از وشان بعد مولوی رفیع الدین کلان سال از وشان ہستم باری ماست۔

الٹی ترتیب بھائیوں کی وفات میں واقع ہوئی اول مولوی عبدالغنی کہ سب سے چھوٹے تھے اس کے بعد مولوی عبدالقادر اس کے بعد مولوی رفیع الدین سب سے بڑا میں ہوں۔ اب میری باری ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں حضرت شاہ ولی اللہ کے ان چاروں صاحبزادوں نے بڑے باپ کے بیٹے ہونے کی شان کو بوجہ کمال آخر عمر تک باقی رکھا۔ شاہ عبدالغنی چھوٹے صاحب نے تو کم عمر پائی۔ لیکن ان کی لافانی قدرت نے ان کے نسل "شہید" حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ سے فرمادی۔ ناظرین "الفرقان" جن کے حالات سے شہید نمبر کے ذریعہ سے واقف ہو چکے ہیں۔ اور یہیں بھی علم دین کے دائرہ کا ایسا کون ہے جو ان سے اور ان کے محیرالعقول وہ ہوش کارناموں سے تھوڑا بہت واقف نہیں ہے شاہ عبدالقادرؒ نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ اگرچہ عزلت میں گذار دیا۔ لیکن صرف امیر شاہ صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کی ایک صاحبزادی تھیں۔ کل جائداد زندگی ہی میں ان ہی صاحبزادی اور دوسرے بھائیوں پر تقسیم فرما کر اکبرآبادی مسجد کی ایک سہ دری میں اپنی زندگی بسر کردی۔ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالعزیزؒ دونوں متاہل ہوئے جن میں شاہ عبدالعزیز کی کوئی نرینہ اولاد نہ ہوئی صرف تین صاحبزادیاں

تھیں اور شاہ رفیع الدین کے چار لڑکے مولوی موسیٰ، مولوی عیسیٰ، مولوی مخصوص اللہ مولوی حسن جان ہوئے۔ ان میں سے مولوی عیسیٰ صاحب کی شادی شاہ عبدالعزیز کی ایک صاحبزادی سے ہوئی اور بقیہ دو صاحبزادیوں میں سے ایک مولوی افضل صاحب اور دوسری مشہور رفیق شہید مولانا عبدالحی الخطیب المجاہد سے ہوئی تھی۔ مولوی افضل ہی کے دو صاحبزادے یعنی شاہ محمد اسحق۔ ولد شاہ محمد یعقوب صاحب ولی اللہی خاندان کے آخری یادگار دلی میں رہ گئے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی دلی جب مسلمانوں کی دلی ہونے کی خصوصیت کو قطعی طور پر کھو چکی تو دونوں بھائی ۱۸۵۶ء میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ حجاز ہجرت کر گئے اور اسی سرزمین پاک میں ہندوستان کے یہ علمی خزانے مدفون ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ کا کچھ حال پہلے گذر چکا ہے۔ آخر میں چاہتا ہوں کہ دلی ہی کے ایک چشم دید گواہ کے بیان کو جو اس خاندان اور اس مدرسہ کے متعلق ہے درج کر کے اس مقالہ کو ختم کر دوں گا۔ کاتی فی ذالک لعبرۃ

قفانبک من ذکری حبیب و منزل

شاہ ولی اللہ کے مدرسہ کا حال اور غدر میں اُس کی بربادی

دلی کے اس عجیب و غریب علمی و دینی خاندان اور اس خاندان کے دارالعلوم کا آخری انجام وہی ہوا جو ہر اس چیز کا ہے جس کا تعلق اس عبوری دور کی ابتدائی زندگی سے ہے دلی کے آثار و مقامات کے ذاتی تجربہ کار مولوی بشیر احمد مرحوم اپنی کتاب دارالحکومت دلی ہی میں لکھتے ہیں:۔

جب شاہ (شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا۔ تو مولانا محمد اسحقؒ))

صاحب نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمہ لی۔ ۱۲۵۸ھ میں آپ نے ہجرت
کی تو مولانا مخصوص اللہ صاحب اور مولانا موسیٰ صاحب خلف حضرت
مولانا رفیع الدین صاحب اس کی نگرانی فرمانے لگے۔ ان حضرات نے
بھی ۱۲۷۳ھ میں انتقال فرمایا تو صرف مولانا محمد موسیٰ کے ایک صاحبزادے
میاں عبدالسلام صاحب بہت صغر سن رہ گئے اور ایک صاحبزادی رہ گئیں خاندان
بھر میں کوئی ایسا نہ تھا جو عبدالسلام صاحب کو لکھاتا پڑھاتا۔ غرض یہ سلسلہ جو کئی
پشت سے اس خاندان میں جاری تھا بند ہو گیا۔ غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے
گرا دیئے گئے۔ کڑیاں تختے تک لوگ اٹھا لے گئے۔ خاندان خالی رہ گیا کیونکہ ایک
شریف گھرانے کی تھی کہ الٰہی توبہ، جس کی لاٹھی اس کی بھینس جس کا جس پر قابو
چلا قابض ہو گیا۔ اب متفرق لوگوں کے مکان اس جگہ بن گئے ہیں مگر محلہ شاہ
عبدالعزیز کے مدرسہ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے اس خاندان میں سوائے ایک
آدھ خاتون عصمت کے اور کوئی نام لیوا اور پانی دیوا نہ رہا۔

مولوی بشیر مرحوم نے اس سے بھی زیادہ دردناک واقعہ ایک دوسری جگہ یہ درج کیا ہے
کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنی زندگی میں اپنے نواسوں مولانا محمد اسحاق اور مولانا یعقوب کو
جو مکان بنوا کر دیئے تھے اور جہاں شاہ اسحاق صاحبؒ نے ان میں کچھ دن درس دیا تھا اب

"اس مدرسہ میں چھوٹے چھوٹے مکانات بن گئے ہیں۔ جہاں کسان وغیرہ
غریب لوگ رہتے ہیں۔ یہیں ایک چھوٹی سی مسجد آپ ہی کے نام سے مشہور ہے
جس میں آپ نماز پڑھتے تھے ... چونکہ یہ کل جائداد سابقہ بہادر الشیو [illegible]
صاحب کی ہے اس لئے مولوی بشیر مرحوم نے اس کے بعد جو فقرہ لکھا ہے۔